اور
خون
آفاق احمد

اور خون

آفاق احمد

ملنے کا پتہ

سیمانت پرکاشن

۹۲۲- کوچہ روہیلا خاں

دریا گنج - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قیمت ——————— دس روپے
تاریخ طباعت ——————— ۱۹۸۰ء
ناشر ——————— خرم پبلیکیشنز۔ بدایوں
مطبوعہ ——————— بریلی الیکٹرک پریس۔ بریلی

انتساب

اپنی پیاری امّی کے نام

جنھوں نے پیار سے گود میں بٹھا کر مجھے بہت سی

کہانیاں سُنائی ہیں

آفاق

فہرست

تنہائی

"میں جنم جنم سے تمہارا منتظر تھا"

"میں جانتی ہوں" اس نے یگانگت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا..

میری زندگی! تم کیا جانو، زیست کی گود میں پلتے ہوئے یہ لمحات کتنے صبر آزما تھے... ہر لمحہ - ہر آہٹ..... ہر آن... ہر دھڑکن پر یہ گمان "ہوتا تھا کہ تم اپنی تمام تر رعنائیاں سنوارے میرے خلوت کدے میں چلی آئی ہو.. امید و بیم کی یہ کیفیات! میں نہ جانے کب سے منتظر ہوں کہ تم اپنے دستِ حنائی سے میری مسرتوں کے چراغ جلا دو.

اور آج.......

اور آج کیا؟... کہو میرے ندیم!.... سچ.... میں تم سے کبھی دور نہیں تھی... کبھی دور رہ بھی نہیں سکتی.... یہ مجبور راتیں اور مصلحت کی یہ زنجیریں صرف تمہارے جذبۂ احساس کو جلا دینے کے لیے ہیں... میں یہ قیود عائد کر کے تم سے دور نہیں، بلکہ قریب تر آئی ہوں... محبت کو بے پایاں جذبہ کے خام پہلوؤں کو

پختہ تر کیا ہے . . . تم چپ کیوں ہو؟ . . کیا ناراض ہو گئے . . ؟
نہیں تو . . . میں بھلا تم سے ناراض کیوں ہونے لگا جسم کبھی روح سے ناراض ہو سکتا ہے ۔ میں سوچ رہا تھا . . . .
"کیا سوچ رہے تھے . . . . ؟"
یہی کہ جب تم میرے قریب نہیں ہوتیں . . . . تو کتنے ہی شکوے ۔ کتنے ہی گیت میرے لبوں سے ابھرتے ہیں . . . اور دل یہ چاہتا ہے کہ تم اچانک میرے سامنے آ جاؤ میری زرینہ . . . . میں تمہاری جدائی کے گیت تمھیں کو سناؤں . . . تمھاری شکایتیں تمھیں سے کروں . اور جب . . . جب تم سامنے آ جاتی ہو تو صرف تمھیں دیکھتا رہ جاتا ہوں"۔
"میں کب تک یونہی لکھتا رہوں گا ؟" ذہن نے سوال کیا اور اعتراض معقول تھا ۔ اس لیے میں نے ایک لمحہ سوچ کر قلم رکھ دیا . . . . لیکن دوسرے ہی لمحہ تنہائی کے شدید لیکن تیخ احساس نے پھر آن دبوچا ۔
"یہ جدائی کے شب و روز بہت مشکل ہے !" میں نے گنگنانے کی کوشش کی . . . لیکن کس کی جدائی ؟ پھر سوال پیدا ہوا ۔ . . . کیا زرینہ کی . . . اور اگر ایسے میں سچ مچ زرینہ آ جائے تو کیا ہم ایسی باتیں کریں گے . . یہ مرصع ، تراشی ہوئی گفتگو ، یہ نپی تلی باتیں یہ استعارے . یہ ڈھلے ہوئے خیالات . . . کیا واقعی یہی زندگی ہے . . . اور اگر ہے تو اس کا مقصد . . . اور اگر کوئی مقصد ہے تو پھر اس کی ترجمانی . . . . زندگی ، مقصد اور اس کی ترجمانی . . . یہی اذلی تگڈم . . . پھر اپنے تمام الجھاؤ سنوارے ہوئے سامنے آ کھڑی ہوئی . . . اور اس الجھاؤ کے پیچھے وہی کھوکھلا پن . . . . ایک خلاء . . . اور پھر وہی شدید احساس تنہائی . . . .

میں نے گھبرا کر پھر قلم اٹھا لیا......

یاسمین زریں... اب تو تم آ ہی گئی ہو... اس لیے صحن میں جھاڑو دو
اور باورچی خانہ سنبھالو... میرے دو بنیان گندے ہیں۔ انہیں
دھو کر پھیلا دینا...
لاؤ کپڑا دو... میں راشن لینے جاتا ہوں، اور اگر راشن گھر
میں موجود ہے تو سیدھی طرح بتاؤ۔ میں کیا سبزی لاؤں... اور ہاں،
سامنے میز پر وحیدہ رحمان کی تصویر کے پیچھے چار مینار کی ڈبیہ رکھی
ہے... وہ اٹھا دو......

میری طرف منہ پھیلائے کیا دیکھ رہی ہو... چار مینار —!
تم چار مینار بھی نہیں جانتیں...... لیکن تم جان بھی کس طرح سکتی ہو۔
نہ تم سگریٹ پیتی ہو اور نہ حیدرآباد گئی ہو...... مجھ سے غلطی ہو گئی
— تم جان سکتی ہو... کیونکہ میں جانتا ہوں...... اور خود بھی
حیدرآباد نہیں گیا... میں صرف چار مینار سگریٹ پیتا ہوں......
لیکن میں چار مینار کے بارے میں جانتا ہوں۔ — کیونکہ میں پڑھ سکتا
ہوں اور اگر پڑھ نہیں سکتا تو سُن سکتا ہوں، اور تم بھی سُن سکتی
ہو...... اب بھی سُن رہی ہو... دراصل حیاتِ انسان کی
بے پناہ تاریخ میں قوتِ سامعہ سب سے زیادہ بروئے کار رہی ہے
... تحریر و تقریر پہ پابندیاں لگتی آئی ہیں...... اور لگتی رہیں گی
لیکن ازل سے آج تک اور آج سے ابد تک ہم سُنتے آئے ہیں،
اور سُنتے رہیں گے — سُنو! اور اُبل پڑو — سنو سمجھو اور
خاموش رہو۔ سنو، نہ سمجھو لیکن بولتے جاؤ۔ — یہ لازوال انسانی

افعال ہیں۔ جن میں سُننا ہمیشہ سے مشترک خصوصیت رہی ہے۔۔۔
مگر ایسا بھی نہیں ہے۔ معصوم زرینہ کی جبیں پر بل پڑتے گئے۔
اس کی چمپئی رنگت سنولاتی گئی۔۔۔ نرم و نازک رخساروں پر کاجل
کی نہیں چھینٹے لگیں۔ اُس کے گلاب کی پتیوں جیسے نازک لب
سیم کی بھولی ہوئی، پھپھوندی لگی ہوئی پھلیوں کی طرح سُوج کر
کالے ہو گئے ـــــ

یہ تمھیں کیا ہوا؟ ـــــ زرینہ تمھیں کیا ہوا؟ آخر تم خاموش
کیوں ہو ـــــ سُننے پر تو کوئی پابندی نہیں ہے ـــــ میں تمھیں
مقدس ویدوں کے لافانی منتر سناؤں گا ـــــ یہ تمہاری سہمی ہوئی
آنکھیں حیران کیوں ہو رہی ہیں۔۔۔ کیا تم سُن نہیں سکتیں ـــــ کیا کسی نے
تمہارے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہے۔ ـــــ

ہٹ جاؤ زرینہ ـــــ بس اب خدا کے لیے ہٹ جاؤ ـــــ میں
تمھیں دیکھتے دیکھتے اکتا چکا ہوں ـــــ یہ کیا سر جھاڑ منھ پہاڑ میرے
سامنے کھڑی ہو ـــــ جاؤ گوبر تمہارا منتظر ہے ـــــ اُپلے تھاپو
ـــــ اور اگر اس کام سے فارغ ہو چکی ہو تو سر میں کڑوا تیل ڈال کر دھوپ میں جا بیٹھو
اور پھر تم اور پڑوسن بیٹھی ہوئی ایک دوسرے کے سر سے نکال کر بیٹا پٹ جوئیں
مارتی رہو ـــــ تو زرینہ تم چلی گئیں ـــــ آئے بھی وہ، گئے بھی وہ ـــــ
مگر فسانہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے ـــــ واقعی یہ افسانہ کبھی ختم نہیں ہوگا ـــــ
میں نے اکتا کر پھر قلم رکھ دیا ـــــ تنہائی کا شدید احساس پھر اعصاب
پر مسلط تھا ـــــ میں نے "گرداب" اٹھالی ـــــ اختر الایمان کا ذہن
غم زیست کے اندازوں میں گھرا ہے۔ اور وہ سر ہتھیلی پر دھرے بیٹھے

کچھ سوچ رہے ہیں —— غالباً یہی کہ یہ تنہائی کس طرح رفع ہو——
یا پھر شب کے بستر پر جو ریاکاری کے دھبے ہیں۔ کاش ان کو سورج کی
کرنیں دھو ڈالتیں — لیکن یہ بھی کہاں ممکن ہے —— اسی لیے شاید
انھوں نے سنجیدگی سے پتھر کے صنم پوجنے کا ارادہ کرلیا ہوگا۔ کیونکہ
گوشۂ احرام کے سناٹوں سے خوابیدہ فراعین نہ جانے کب کے انگڑائی لیکر
جاگ چکے ہیں——

اس "گرداب" سے نکلا تو کمی نقش کی فریاد میں کھو گیا —— اگرچہ
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے ... مگر میں پھر بھی سمجھ گیا کہ فیض صاحب
بھی اس مصروف دنیا میں اپنی "تنہائی" سے اکتا چکے ہیں۔

"گل کرو شمعیں — بڑھا دو مے و مینا و ایاغ" تو انھوں نے
غالباً اصطلاحاً کہا ہوگا —— ورنہ اس ایٹمی دَور میں انھوں نے اپنے
نوکر کو بلا کر سرگوشی کی ہوگی۔

"اے دیکھو! یہ بوتل اور گلاس کہیں چھپا دو —— میری چارپائی
کے نیچے — یا پھر اس الماری کے پیچھے —— ذرا جلدی کرو ——
کہیں زرینہ نہ دیکھ لے —— وہ جو آنے والے تھے، غالباً آج نہیں آئینگے
— شاید کوئی اور انگیجمنٹ ہو —— اس لیے بہتر ہے کہ تم لائٹ بھی
آف کرتے جاؤ —— یا رہنے دو —— میں خود کرلوں گا — یا تم
سونے سے پہلے نیچے کا دروازہ ضرور بند کرلینا ......

اگرچہ دھوپ مرجھانے لگی ہے لیکن شام دور ہے —— ورنہ میں بھی
شمعیں جلاتا اور پھر انھیں گل کرکے غڑاپ سے لحاف میں منھ لپیٹ کر
سو جاتا —— مجاز مرحوم نے اگرچہ قلم چھوڑ کر تلوار اٹھانے کا مشورہ

دیا تھا ــــ مگر میں چونکہ ذرا بزدل واقع ہوا ہوں اس لیے قلم پھینک کر سائیکل اٹھا لیتا ہوں ــــ

ہوا دھیرے دھیرے ہلکورے لیتی بہہ رہی ہے ــــ میں ہمہ تن گوش ہو کر اس کے زیر و بم میں لپٹی ہوئی مدھم گنگناہٹ سننا چاہتا ہوں ــــ اور جب نہیں سن پاتا تو خود ہی گنگنانے لگتا ہوں ــــ لیکن اس زیر لب گنگناہٹ کو ابھرنے نہیں دیتا۔ کبھی دوسرے راہ گیروں کو میرے بے سرے پن کا احساس ہو جائے ــــ اگرچہ میں جب بھی گوش بر آواز ہوتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کسی کو سر تال کا پتہ نہیں ہے ... اور جس کو دنیا کے اس ساز کی سر تال کا پتہ ہو جائے تو وہ پیغمبر بن جاتا ہے ــــ ہاں تو صاحب! یہاں تو اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ بھی نہیں ہے ــــ بلکہ دوسروں کی ڈفلی اور اپنی بھیرویں ہے ... میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر میں یہیں سر راہ چیخ چیخ کر گانا شروع کر دوں تو کسی کو میرے بے سرے پن کا احساس نہ ہوگا ــــ کس کو فرصت ہے جو اپنی چیخوں کی گہرائیوں سے ابھر کر سوچے ــــ اور جو اپنے آپ کو دھوکا دے کر فرصت نکال بھی لیتے ہیں ــــ وہ مجھے یا تو انٹلکچوئل سمجھ کر میرے متعلق مضامین لکھیں گے ــــ یا پھر مجذوب سمجھ کر ریس کی ٹپ یا سٹہ کا نمبر پوچھنے آئیں گے ــــ مگر میں ڈرتا ہوں ــــ شاید اس غول بیابانی میں کوئی انسان بھی ہو ــــ جو میرے ڈھونگ کو سمجھ کر زیر لب مسکراتا ہوا آگے بڑھ جائے ــــ میں اس دنیا کی ساری بیوقوفیاں اور تضحیک تو برداشت کر سکتا ہوں۔ لیکن اس کی مسکراہٹ میں طنز کی ہلکی سی رمق

بھی میری برداشت سے باہر ہے ـــــ اس لیے میں اپنی گنگناہٹ کا
زیرِ لب دم گھونٹے رہتا ہوں ـــ
ہوش ـــ ! ایک گھبرائی ہوئی آواز آئی ـــــ اور میں ایک
سیدھے ۔ سادے دیہاتی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا ـــــ
بات پہنچی مری زرینہ تک ! ـــــ اے کاش اس مصیبت
کے مارے مشغول دیہاتی کے بجائے یہاں کوئی زرینہ ہوتی ...
میں نے سائیکل کو لہرا کر رام باغ پل پر لاتے ہوئے سوچا ـ
مگر کیا ہوئی ـــ دل ٹکرا جاتے ـ کیوپڈ کا تیر ہم دونوں کے
دلوں کو چھیدتا ہوا کہیں دور چلا جاتا ... اور میرے نزلہ سے
خشک اور تمہارے لبِ اشک سے تازہ ہونٹوں سے ایک گیت ابھرتا
ـــــ محبت کا ازلی گیت ـــــ اور پھر ہم دونوں دنیا کی آلائشوں
سے دور، افق کے اُس پار جہاں زمین اور آسمان گلے ملتے ہیں ـــ
ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلے جاتے ـ لیکن میری سائیکل
کا کیا ہوتا ؟ اگرچہ میں زرینہ کا طلبگار ہوں ـــ مگر چور نہیں ـــ
اس لیے آخری قسط ادا کیے بغیر میں سائیکل چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔
اسٹیڈیم سے لوگ اُبل پڑے ـــ غالباً کوئی فٹ بال
میچ ختم ہوا تھا ـــــ سائیکل کی رفتار بڑھ گئی ـــــ میں تنہا ہوں۔
لیکن انسانوں کے اس جمِ غفیر سے کیوں بھاگ رہا ہوں ـــــ
یہ بات خود میری سمجھ میں نہیں آئی ـــــ
اب میں انکیس بیچنج روڈ پر ہوں اور زندگی حسبِ دستور
انتہائی مشغول ہے ـــ لیکن میں پھر بھی تنہا ہوں ـــ میری

زرینہ کا خالی فریم مجھے ایک بار پھر پکارتا ہے اور اس پکار پر میری نظریں سامنے اٹھتی ہیں ـــــ سامنے پہاڑوں کی سربلند چوٹیوں پر کچھ دودھیا بادلوں کی شریر بچیاں سرگوشیوں میں مصروف ہیں۔ ان سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی ہوا کی لطیف سرسراہٹوں سے ایک گیت ابھر رہا ہے ـــــ اور دور اس سڑک پر ایک تانگہ جا رہا ہے جس میں کسی گلابی سی جھلک پر میری نگاہیں خود بخود ٹھٹک کر رہ جاتی ہیں۔

میں تنہا ہوں ـــــ دور سامنے پہاڑوں کی سر بہ فلک چوٹیاں، آوارہ بادل اور ہوا کی سرسراہٹیں مجھے پکار رہی ہیں۔ میری سائیکل کی رفتار تیز ہونے لگتی ہے ـــــ میں ان پہاڑوں سے دنیا کے نشیب و فراز کی کہانی سنوں گا ـــــ بادلوں کے ساتھ اپنی روح کو ہم آہنگ کر کے نئی دنیا کے گیت گاؤں گا ـــــ

سائیکل کے پہیے اور تیزی سے گردش کرنے لگتے ہیں ـــــ زیرِ لب سوتی ہوئی مسکراہٹ پھر جاگ اٹھتی ہے ـــــ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر لیتا ہوں ـــــ قمیص کا کالر درست کرتا ہوں ـــــ پتلون کی کریس پر نظر جاتی ہے ـــــ اور جوتوں پر ناچتی ہوئی طرحدار پالش پر میں اطمینان کی ایک سانس لیتا ہوں ـــــ فاصلے کم ہو رہے ہیں ـــــ میں تنہا ہوں ـــــ اس لیے میں ان پہاڑوں، اٹھکھیلیاں کرتے بادلوں اور گنگناتی ہواؤں سے نزدیک ہونا چاہتا ہوں ـــــ میرا اس ہر لمحہ قریب ہوتے ہوئے تانگہ سے کوئی واسطہ نہیں۔ جس میں موجود گلابی پیکر کے خد و خال واضح ہونے لگے ہیں ـــــ آپ کی قسم میں اس گلابی جھلک سے اپنی زرینہ کے خالی فریم کو

بھرنا نہیں چاہتا ——

آپ مسکرا کیوں رہے ہیں ؟

یقین نہیں آتا !!

سچ جانئے —— آپ کو دھوکا ہوا ہے۔

—— ⁘ ——

حرام

اپنے پُرانے گھر کو چھوڑ کر ٹلہ میں آتے ہی پارو کو معلوم ہو گیا کہ "نورے خلیفہ" ایک بدمعاش اور خطرناک غنڈا ہے۔ کلوا مہتر جب صفائی کرنے آیا تو اس نے مفلسی کے آغوش میں دم توڑتی ہوئی پارو کی بھرپور جوانی کو تاکا اور ناصحانہ انداز میں پوچھنے لگا

"بی بی جی . . . آپ کے ساتھ کوئی مرد نہیں ہے"

"کیوں؟" پارو نے چونک کر نوخیز کلوا کی طرف دیکھا۔

"نہیں . . . یوں ہی . بی بی جی . . . . ." وہ کچھ سٹپٹا سا گیا۔

پھر کچھ سوچ کر اُس نے جھاڑو ایک طرف رکھدی اور اپنے لمبے لمبے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے پھر پوچھا

"پہلے آپ کہاں رہتی تھیں؟"

"چھیپی تلاؤ میں" پارو نے بے اعتنائی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"چل اٹھ!! باتیں مت بھوڑ۔ ذرا جلدی سے جھاڑو لگا دے۔ مجھے ٹھیکیدار کے گھر جانا ہے۔"

کلوا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اس سے پہلے کہ اس کی گنگناہٹ مدھم سُروں میں ڈھل جاتی۔ پارو پھر بولی۔

"ارے او کلوا! جرا جلدی کر ـــــ اور ہاں اگالدان بھی مانجھ دیجیو۔"

کلوا کا منھ اُتر گیا۔ اُس نے ایک جھٹکے سے اپنے ماتھے پر پڑے ہوئے بال اوپر کیے اور لپک کے جھاڑو اٹھالی ـــــ ایک بار پھر اس نے چور نگاہوں سے پارو کی طرف دیکھا، اور جھاڑو لگاتے ہوئے بولا۔

"بی بی جی، آپ ٹھیکیدار کے گھر بگیا سے ہو کر جاتی ہیں ـــ"

"ہاں ـــ کیوں؟"

"ذرا سنبھل کر جانا ـــ" اس کا ناصحانہ انداز پھر سے عود کر آیا۔

"نورے خلیفہ کی چوپال ہے ادھر"

"ہوں" وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی ـــ "ہوگی۔ چل تو اپنا کام کر۔"

پارو بالوں میں کنگھی کرتے اندر چلی گئی۔

جب پارو کا شوہر رکشا کھینچتے کھینچتے ایک دن دم توڑ گیا، تو ٹھیکیدار علی بخش کو اس کی غربت اور جوانی پر رحم آگیا ـــ انھوں نے آنکھوں پہ اپنا خوشبو میں بسا رومال رکھتے ہوئے سسکتے ہوئے کہا کہ انھیں اللہ دیے مرحوم سے بہت محبت تھی اور وہ حتی الامکان اس کے رکشا میں بیٹھا کرتے تھے ـــ ٹھیکیدار کے مشورہ پر وہ چھپیّا تالاب سے اٹھ کر

کوٹلہ میں آگئی۔ یہاں سے ٹھیکیدار کا گھر نزدیک تھا اور وہ روزانہ صبح و شام ان کے یہاں جاکر برتن مانجھتی اور کھانا بناتی تھی۔

اس کا آٹھ سالہ اکلوتا لڑکا جمیل ٹھیکیدار کی ایک سائیکلوں کی دکان پر کام سیکھا کرتا تھا۔ فی الحال وہ اپنی پھٹی ہوئی قمیص کا دامن منھ میں تھام کر گاہکوں کی سائیکل میں ہوا بھرتا اور جب دوپہر کو استاد آرام کرنے کے لیے لیٹتے تو ان کے پیر دباتا یا سر میں چمپی کرتا۔۔۔

"ارے او کلوا! ٹھیک سے دے جھاڑو۔۔۔ تمام کوڑا چھوڑ دیا ہے۔۔"

پارو نے پھر سے صحن میں آتے ہوئے کہا۔۔۔ اس نے کنگھی میں الجھے ہوئے بالوں کو انگلی پر لپیٹ کر گول بنا کر تھوکا اور نالی میں پھینک دیا۔ کلوا کی نظر ان سنہری بالوں پر پڑی اور ایک بار پھر وہ پارو کو تکنے لگا۔ جس کے تقریباً سنہری بالوں میں اس کا شہابی چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

"ذرا جلدی کر میرے بیرا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے" — پارو نے صحن میں پھیلے ہوئے کپڑے سمیٹتے ہوئے کہا۔

"بی بی جی — ذرا بچ کے رہنا۔۔۔ میرا مطلب ہے، کیا نام ذرا بچ کے جانا — ادھر نورے پہلوان کی چوپال۔۔۔"

"ہٹ پرے۔ میری جوتی سے ہوگا کوئی نورا۔ نورا اوغالدان مانجھ اور لمبا بن۔"

پارو نے ایک بار پھر نورخاں کے خیال کو جھٹک کر آگے بڑھنا چاہا کلوا مہتر ہو یا حکیمن دائی۔۔۔ پھیری والا بزاز ہو یا سبزی والا۔

یہاں تک کہ مولوی صاحب بھی اپنی چھوٹی داڑھی پہ ہاتھ پھیر کر اُسے نورے پہلوان سے بچنے کی تلقین کرتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ جب بھی ٹھیکیدار کے یہاں جاتی تو اِسے نورے پہلوان کی چوپال کے نیچے سے گزرنا پڑتا ۔ ۔ ۔ وہاں پہنچتے ہی غیر شعوری طور پر اس کے قدم تیز ہو جاتے ۔ ۔ ۔ ۔ دوپٹہ بار بار سر سے ڈھلک جاتا اور ایک ہلکی سی پھریری اسے سر سے پیر تک جھنجوڑ کر رکھ دیتی ———

اس چوپال پر بھی عجب عجب تماشے ہوتے رہے۔ کبھی کوئی مرغا بنا ہوا ہے اور رو رہا ہے۔ کبھی ہجڑوں کی ٹولی آئی ہوئی ہے۔ اور ناچ گانے ہو رہے ہیں ۔ کبھی کسی کو اُلٹا لٹکنے کی سزا ملی ہے تو کبھی دعوتیں اُڑ رہی ہیں ۔ غرض ہمیشہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ جوان رہتا۔ ۔ ۔ ۔ وہ سمٹی، جسم کو چُراتی، مگر کنکھیوں سے چوپال پر دیکھتی ہوئی گزر جاتی ۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اسکی نظریں نور خاں کے کڑے تیوروں سے ٹکرا جاتیں ۔ اس کی گھنی مونچھوں کے زیر سایہ پان سے سرخ ہونٹ ہمیشہ مسکراتے نظر آتے ۔ ایک سفاکانہ مسکراہٹ اور اس کی بڑی بڑی ابلی ہوئی آنکھوں میں نہ جانے کچھ عجیب سا پیغام نظر آتا اور اُسے ایسا لگتا جیسے نور خاں کی نظریں اس کے جسم سے پار ہو جائینگی ۔ ۔ ۔ کبھی کچھ ادھورے، ذومعنی فحش سے جملے اس کے کانوں میں پڑتے ۔ جس پہ نور خاں کے جوڑی دار بیٹھے قہقہے اگلا کرتے ۔ ۔ ۔ ۔ نہ جانے کیوں ہر قہقہہ، ہر بات اسے جھنجوڑ کر رکھ دیتی اور وہ یہ سوچتی ہوئی تیز گامی سے قدم اٹھاتی رہتی کہ یہ سب کچھ

اُسے سنانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔

ٹھیکیدار کا گھر نورے کی چوپال کے نزدیک ہی تھا۔ وہ جب بھی اوپر کے کمروں میں صفائی کرتی تو چوپال کی ایک ایک بات سنا کرتی اور اگر کبھی چوپال سنسان ہوتی تو اُسے ایک انجانی کرید سی لگی رہتی۔ اور خواہ مخواہ سوچنے لگتی کہ نہ جانے آج نورا کہاں ہو گا۔ شام کو جب وہ گھر لوٹتی تو خود اپنے قدموں کی چاپ سن کر ڈر جاتی۔ اس کے کانوں میں سیٹیاں گونجا کرتیں اور کسی موہوم سی آہٹ پر بھی اس کا دل بلّیوں اچھلنے لگتا اور پسینہ کی ایک سرد لہر اس کی رگ رگ میں رچ جاتی۔ اور اگر کبھی خلافِ معمول چوپال پہ اندھیرا ہوتا تو نہ جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہوتا، جیسے کوئی چوپال سے اُترے گا اور اس کی گردن پکڑ کر اوپر اٹھا لے جائے گا۔

ایک دن جب وہ نورے خلیفہ کی چوپال کے نزدیک پہنچی تو کسی نے نورے کے پیر دباتے ہوئے جھک کر کان میں کچھ کہا۔

"ہاں ایک دن یہ ضرور ہو گا" پہلوان نے حسبِ معمول اپنی بھاری بھرکم بلند آواز میں کہا۔

پارو کانپ گئی، ایک مدھم چیخ اس کے لبوں میں لرز کر ٹوٹ گئی۔

اور وہ کام کرتی ہوئی دن بھر ہولیں کھاتی رہی کہ ایک دن کیا ہو گا۔

جوں جوں شام کے سُرمئی دھندلکے فضا میں رچ رہے تھے، اس کی گھبراہٹ بڑھتی جاتی تھی مگر شام ہوتے ہوتے چھوٹی ٹھیکیدارنی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور پھر اسی لے دے میں کہ اُسے وقت کا بھی خیال نہ رہا۔

رات کے تقریباً دس بجے وہ ٹھیکیدار کے گھر سے نکلی ——

نور خاں کی چوپال سنسان تھی، اندر دالان میں ایک مدھم سی لالٹین ٹمٹما رہی تھی — پتہ نہیں کہیں جمیل نہ سو گیا ہو اور گھر میں ہی جھاڑو پھیر جائے۔ اس کی گھبراہٹ بڑھ گئی، میونسپلٹی کی لالٹین کی دم توڑتی ہوئی روشنی میں جیسے ہی وہ آگے بڑھی، تو ایک ڈوبی ہوئی آواز آئی

"ذرا سنو"

وہ سر سے پیر تک لرز گئی اور اس سے پہلے کہ ایک چیخ اس کے لبوں سے پھوٹتی، وہ بھرّائی ہوئی آواز پھر ابھری۔

"ڈرو نہیں — میں ٹھیکیدار ہوں"

ٹھیکیدار صاحب ہاتھ میں کچھ لیے اندھیرے میں کھڑے تھے۔

"یہ کیا ہے" اس نے ٹھیکیدار کے بڑھتے ہوئے ہاتھ میں کچھ دیکھ کر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

یہ — یہ مٹھائی ہے ... تمہارے لیے ... میرا مطلب ہے، تمہارے جمیل کے لیے لایا ہوں، ... بڑا اچھا لڑکا ہے .... ذرا ادھر آؤ ... تم بہت کام کرتی ہو ... تم بڑی اچھی ہو ... ڈرو مت ... میں بہت پیسے دونگا ... ہاں ... یہاں کوئی نہیں ... ادھر آؤ ... ہاں ... ادھر کافی اندھیرا ہے ....

ٹھیکیدار صاحب بھرّائے ہوئے لہجہ میں کہتے رہے ...

اس سے پہلے اس کی قوتِ مدافعت بیدار ہوتی۔ ٹھیکیدار نے اسے دبوچ لیا — اس کی قوتِ گویائی جیسے سلب ہو چکی تھی — اور اسے ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ ان اندھیروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ڈوب جائے گی۔

مگر دفعتاً کسی نے ٹھیکیدار کو نوچ کر الگ پھینک دیا۔

"نور خاں کی چوپال کے نیچے حرام نہیں چلیگا" اور اس سے پہلے ٹھیکیدار صاحب کچھ سوچ سمجھ سکتے۔ نور خاں کا چاقو دستہ تک انکے پیٹ میں ڈوب گیا۔

پارو گم سم کھڑی تھی اور ایک لمحہ کے لیے ایسا لگا، جیسے اس کا رکھوالا اس کا اللہ دیا اس کے سامنے کھڑا ہے۔ نہ جانے اس کے دل کے کس گوشے سے بے اختیار پیار امڈ پڑا۔ وہ تقریباً مدہوش ہو کر آگے بڑھی اور نور خاں سے چمٹ گئی۔

"ہٹ حرام زادی" نور خاں نے پیچھے ہٹ کر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا۔

"چلو چمپا بائی"۔ اس نے ایک اور کانپتے ہوئے سایہ کا ہاتھ پکڑا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چوپال پر چڑھ گیا۔

خلاء

سولومن جسونت سنگھ حیرت سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔۔۔۔
ابے یہ منہ پھاڑے کیا تک رہا ہے۔ اُس نے کہا۔۔۔۔
جاوید تو ——!!
اور پھر دونوں بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔
بارہ سال۔۔۔۔! ایک طویل عرصہ —— گم شدگی —— اور
اچانک ملاقات۔۔۔۔
مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا۔۔۔۔ سولومن نے اُسے پیار
سے کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔۔۔۔
میں خود سوچ رہا تھا کہ تم ملو گے بھی کہ نہیں۔۔۔۔ کیا پتہ مکان
ہی چھوڑ گئے ہو۔۔۔۔۔
ارے بھئی ہم تو کوئیں کے مینڈک ہیں۔۔۔ اگر جائیں بھی تو
کہاں جائیں۔۔۔۔۔

اور پھر باتیں ہوتی رہیں ...... بچپن کی معصوم یادیں ....
کالج کے دن ... اور اچانک سوہومن نے پوچھا ....
شادی ہوگئی تیری ۔۔۔؟
ہاں ۔!
کب ۔۔۔؟
کوئی پانچ سال ہوئے؟
باپ بنے یا نہیں ....
چار سال پہلے ....
کتنے بچے ہیں چار؟
نہ بابا ۔ صرف ایک ۔۔۔ میں بھوکوں کی تعداد میں اضافہ کا قائل نہیں
تمہارے سوٹ اور کار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تم ہزاروں
بھوکوں کا پیٹ پال سکتے ہو ......
اگر کل کا مفلس آج امیر ہو سکتا ہے .... تو اس کی کیا گارنٹی
ہے کہ کل پھر وہ فاقہ مست نہیں ہوگا ....
چھوڑو یار ... مجھے معلوم ہے کہ تم معاشیات میں ایم ۔ اے
کر کے ہی بھاگے تھے ....
اور اب آکسفورڈ یونیورسٹی سے P.H.D کر چکا ہوں ...
اچھا ... آج توجہ نہ ہو جائے کم ہے .... مجھ پر تو حیرتوں
کے ہمالیہ پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں ....
یہ زندگی بھی عجب شے ہے .... تم کہتے ہو کہ میں بے حد بدل گیا ہوں
اور اس کے برعکس تم بالکل ویسے ہی ہو .... ذرا ذرا سی بات پہ متحیر ہو جانا ..

وہی وقت سے پہلے سفید بال ... وہی چپٹا پہاڑی چہرہ ...
بڑھاپا آگیا مگر اپنے حسن پر ابھی تک ناز ہے ....
اگر حسین ہوتا تو کیا شہناز مجھے ٹھکرا دیتی ....
خیر یہ تم غلط کہتے ہو ..... اُس نے تمھیں کبھی نہیں ٹھکرایا ....
اگر ٹھکرایا نہ ہوتا تو پھر وہ میری نہ ہوتی ....
کمال ہے جاوید ابھی اگر اس کے ماں باپ نہ مانتے تو وہ کیا کرتی ...
میرے ساتھ بھاگ جاتی ....
ہاں تم گھر سے بھاگ چکے ہو .... اس لیے تمھیں یہ نسخہ اس قدر آسان نظر آتا ہے .... اگر تم لڑکی ہوتے تو میں مزاج پوچھتا .... اور بھئی جاوید معاف کرنا مجھے تو بھاگنا انتہائی گھٹیا فعل نظر آتا ہے ... چاہے وہ کسی لیلیٰ کا مجنوں کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو ......
میں مذاق کر رہا تھا .... مگر تم کیوں شہناز کی اتنی وکالت کر رہے ہو
بڑی مصیبت میں ہیں وہ لوگ ! اس کا شوہر رشوت لیتے ہوئے پکڑا گیا .... اور سنا ہے نوکری سے بھی نکال دیا گیا ہے ...
اور شہناز !
وہ کسی کی ملازمت کرتی ہے .... شاید احمد آباد میں ..... خیر چھوڑو
تم اپنی سناؤ ....
میں کیا سناؤں ... میری کہانی تو تمھیں الف لیلیٰ کا ایک باب معلوم ہوگی
میں کہانیاں بھی بڑے شوق سے سنتا ہوں ۔
لو سنو : ہاں تو ۱۹۵۵ء تک کی زندگی تو تمھیں معلوم ہی ہے ...
اسکول کی چہار دیواری سے کالج کو الوداع کہنے تک ....

اور فیض عام انٹر کالج میں تمہاری مختصر ملازمت تک بھی

ہاں... جب میں ڈیڑھ سو روپے تنخواہ پانے لگا تو سوچا کہ ایام جوانی کے

خواب ابھی پورے ہوں... اور شہناز کی وارفتگی کے پیش نظر

مجھے یقین تھا کہ ہم دونوں صرف ایک دوسرے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔

میرا رشتہ گیا... ان کی امی نے صاف انکار کر دیا...

میری بیٹی کی شادی تو کسی انجینئر سے ہوگی... شہناز کافی روئیں...

مگر ان کے آنسو میری غربت کے داغ نہیں دھو سکے... اور میں... چونکہ

انکار میرے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی نہ تھا... اس لیے اپنے حواس

کھو بیٹھا...

یہ میرے لیے اطلاع ہے...

ارے بھئی محاورہ والے حواس کھوئے تھے میں نے... اور ایک

دن نہ جانے کیا دل میں آئی کہ گھر سے نکل کھڑا ہوا...

خالہ جان کہتی تھیں... بمبئی میں کوئی اچھی نوکری مل گئی ہے...

ہاں میں نے انھیں یہی لکھا تھا... مگر حقیقت یہ ہے کہ جیب میں کل

۲۹ روپیہ تھے اور جسم پر ایک پینٹ اور شرٹ یہی کل کائنات تھی...

Novelty پھر میں نیا ایک مہینہ ٹھوکریں کھائیں... کوئی ملازمت نہ ملی... پھر

S. M. کی ٹریڈ یونین کے سکریٹری سے ملاقات ہوگئی... اس نے مل میں

نوکر رکھا دیا۔ ایک دن سیٹھ صاحب مل کے معائنہ کے لیے آئے تو انھوں

نے مجھے لنچ کے وقفہ میں انگریزی کا رسالہ پڑھتے ہوئے دیکھ لیا... اور

جب انھیں پتہ چلا کہ میں انگلش میں ایم اے ہوں... وہ مجھے اپنے

ساتھ لے گئے...

بوڑھے انسان، دل کے مریض، اور کل کا نئات ایک لڑکی ۔ ۔ ۔ ۔
مجھے انھوں نے اسسٹنٹ منیجر بنا دیا ۔ ۔ ۔ اور مجھے یہ اندازہ کرتے دیر نہ لگی کہ منیجر سیٹھ صاحب کی کمزوری اور بڑھاپے کا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے کچھ دھمکی اور کچھ لالچ دے کر مجھے اپنے ساتھ ملانا چاہا ۔ میں رضامند ہو گیا ۔ ۔ ۔ اور اُدھر سیٹھ صاحب کے گوش گزار سب حال کر دیا ۔ ۔ ۔ سیٹھ صاحب پشیمان اور پریشان ہو گئے ، اور ایک ہلکا دل کا دورہ بھی پڑا ۔ ۔ ۔ مگر سیٹھانی جی اور ان کی لڑکی جو اب تمھاری بھابی ہے ۔ ۔ ۔ دونوں نے مجھ سے کہا کہ تم کچھ ترکیب کرو ۔ جو اس موذی سے چھٹکارہ ملے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے مزدور یونین کے سیکریٹری کو شیشے میں اتارا اور تمام مزدوروں کو Interim Relief کا وعدہ بھی کیا ۔ ۔ ۔
دوسری طرف میں منیجر سے مل کر بڑا ہاتھ مارنے کا مشورہ دیتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔
اور جب نادلٹی مل کی پانچ ہزار کی تھیں چوری سے بک رہی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔
پولیس نے سیٹھ صاحب کے ٹیلیفون پر منیجر کو گرفتار کیا ۔ ۔ ۔ اور ۶ سال قید با مشقت کی سزا ہوئی — اب میں منیجر تھا ۔ ۔ ۔ ایک دن شاہینہ یعنی سیٹھ صاحب کی لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی ۔ ۔ ۔ اتفاق سے میں بھی اس وقت گھر میں موجود تھا ۔ ۔ میں زخمی ہو گیا ۔ ۔ ۔ مگر شاہینہ بچ گئی ۔ ۔ ۔ اس ایکسیڈینٹ سے مل کے مزدور بہت برافروختہ ہوئے وہ پہلے منیجر کا مکان جلانا چاہتے تھے ۔ ۔ ۔ خیر اس سے تو میں نے باز رکھا مگر ان کو پُرامن مظاہرہ کے لیے اکساتا رہا ۔ ۔ ۔ اخباروں نے اس واقعہ کو خوب اچھالا ۔ ۔ ۔ ۔ پچھلے منیجر کو خوب ۔۔۔ گئی ۔۔۔

تعلقات کو خوب سراہا گیا۔۔۔ یوں بھی میں نے اپنے دو ملوں کے مزدوروں

کے لیے مفت اسکول، اسپتال اور کلب وغیرہ رکھے ہیں۔

دوسرے ملوں سے زیادہ ہی ان کو بونس ملتا ہے اور وہ بھی دل لگا کر ایمانداری

سے کام کرتے ہیں۔۔۔ سیٹھ صاحب اپنی اکلوتی لڑکی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیکر

اللہ کو پیارے ہوئے۔۔۔ ہماری ساس نے سب کچھ ہمارے نام کر دیا ہے

۔۔۔۔ اور ہم سب مل جل کر آرام لے رہے ہیں۔

شکر ہے۔۔۔۔ اپنے ایک دوست نے تو قابلِ مثال ترقی کی ——

میں تو اسے اتفاقات کی سازش سمجھتا ہوں۔۔۔۔ میرا اپنا کریڈٹ تو خاص

کچھ نہیں ہے۔۔۔۔

اتفاقات ہی مدد کرتے ہیں۔۔۔ بڑا آدمی وہی بنتا ہے جو اتفاقات

کی نبض کو پہچان سکے۔۔۔۔ خیر یہ بتاؤ بھابی کیسی ہیں۔۔۔ یعنی شکل و صورت

میں شہناز سے اچھی ہیں۔۔۔۔

کہیں زیادہ! کہیں سولومن تم یہ نہ سمجھنا کہ یہ میرا احساسِ محرومی ہے

جو میں شہناز سے اسے بہتر بتا رہا ہوں۔۔۔ وہ حقیقتاً اس سے کہیں

زیادہ خوبصورت ہے۔۔۔۔ لیڈیز یونیورسٹی سے فائن آرٹس اینڈ

انٹیریر ڈیکوریشن میں ڈپلومہ لیا ہے۔۔۔۔

کیوں نہ ہو۔۔۔۔ آخر میری بھابی ہے۔۔۔۔ ہاں اب تو تم شہناز

کو بالکل بھول چکے ہو گے۔۔۔۔

بس یہی سوال مجھ سے نہ پوچھو۔۔۔۔

کیا اب بھی کچھ گڑبڑ ہے۔۔۔ جاوید تمہاری زندگی اب نئی راہ پر

گامزن ہے۔۔۔ بھول جاؤ اس کہانی کو۔۔۔۔

کبھی زخم کو کریدنا کس کو اچھا لگتا ہے ۔۔۔ میرے پاس سب کچھ ہے ، مگر ذہن میں ایک عجیب سا خلا ہے جو کسی طرح پر نہیں ہوتا ۔۔۔

تم سمجھ لو ۔۔۔ وہ مرگئی ہے ۔۔۔

تم یہ کیوں سوچ رہے ہو کہ مجھے اب بھی اس سے محبت ہے ۔۔۔ رہا یہ کہ میں یہ سمجھ لوں وہ مرچکی ہے تو میرے دوست وہ میرے پاس ہے ۔۔۔

کیا مطلب ؟ میں نہیں سمجھا ۔۔۔

ممکن ہے کہ تم مجھ سے نفرت کرنے لگو ۔۔۔ مگر میں مجبور تھا ۔۔۔

معلوم ہوتا ہے کہ اتنے دن کی جدائی سے ہماری دوستی کے شیشہ میں بھی بال آگیا ہے ۔۔۔ ورنہ اس پیش بندی کی تو کوئی ضرورت نہ تھی ۔۔۔

تم ڈاکو اور قاتل بھی ہو ۔۔۔ تو بھی میرے اپنے ہو ۔۔۔

شکریہ میرے دوست ! خیر سنو ۔۔۔ بظاہر زندگی کی تمام مرادیں پوری ہوگئیں مگر ذہن کا خلا بدستور رہا ۔۔۔ یونہی کسی نے ذکر کیا کہ شہناز کا شوہر جو ان دنوں بھوپال میں تھا کافی رشوت لیتا ہے ۔۔۔ میں نے ایک ٹھیکیدار سے کہہ کر اس کو رشوت دلوائی اور گرفتار کرادیا ۔۔۔

تم نے جاوید ؟

ہاں ۔۔۔ اور پھر افسرانِ بالا سے کہہ کر اسے بری تو کرادیا مگر نوکری چھوڑنی پڑی ۔۔۔ میں نے انھیں دنوں اپنے نئے مِل کے لیے Receptionist کا اشتہار بھی دیا تھا اور اس طرح کہ اشتہار شہناز کے ہاتھوں تک بھی پہنچے ۔۔۔ مجبوری کے دن تھے ۔۔۔ اس نے Apply کیا اور میں نے اور بہت سے اچھے کینڈیڈیٹس کو چھوڑ کر اس کا انتخاب کرلیا ۔۔

اور اس کا شوہر —— ؟

وہ بھی احمد آباد میں ہے . . . ابھی تک کوئی کام نہیں ملا . . .
وہ گھر پر بچوں کی دیکھ بھال کرتا ہے اور شہناز میرے مل میں ملازم . .

کیا تم . . . . !

خدارا مجھے غلط مت سمجھو سولومی . . . میں تو اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا . . . میری فاطمہ میری زندگی ہے . . .

تو پھر ؟

تو پھر کچھ بھی نہیں . . . ہر شے اپنے محور کے گرد گھوم رہی ہے اور بس ! ! ایک خلا ہے جو پُر نہیں ہوتا . . .

—.×.—

میں نے ازراہِ ہمدردی سوچا، چلو میں ہی کبھی اس کے یہاں
شربت پی لوں .... مگر وہ لمبے لمبے نقشین گلاس، جو مَیل کی تہوں
سے تقریباً سیاہ ہو چکے تھے، دیکھ کر ہی مجھے اُبکائیاں آنے لگتیں
.... کبھی جب میں خالی الذہن ہوتا تو میں حساب لگاتا، چلو دن میں اس
کے چار گلاس بکتے ہیں، چالیس پیسے ہوئے ... بیس پیسے لاگت سمجھ لو
.... ۲۰ پیسے روز میں کیا ہوگا .... میرا دل یہ بھی قبول کرنے کے لیے
تیار نہیں تھا کہ چار گلاس بھی بکتے ہونگے .... جانے کس قسم کا آدمی
ہوگا جو ان لمبے۔ نقشین اور گندے گلاسوں میں شربت پینا پسند
کریگا .... اور اس پر مکھیوں کا غولِ بیابانی ... شربت کا تو تصوّر
ہی یہ ہے کہ وہ ٹھنڈا، میٹھا، اور مفرح ہو، اور ان تینوں باتوں
کے لیے شکر، برف کے علاوہ صفائی انتہائی اہم ہے ....
مگر پھر بھی گنگو کی دوکان چلے جاتی تھی — وہ اپنا اور اپنے
چھ بچوں کا پیٹ پال رہا تھا ... انھیں دنوں ایک Audit
Party کے ساتھ مجھے سہارنپور جانا پڑا .... اور پورے ضلع کا دورہ
تھا۔ اس لیے دو مہینے لگ گئے ... لوٹ کر آیا ... اور پھر زندگی
دنی پامال راہوں پر چلنے لگی، اگلے روز اتوار تھا یعنی چھٹی کا دن
.... میں سبزی کا تھیلا لے کر بازار کی طرف چلا ....
گھنٹہ گھر ... اس سے تھوڑا سا آگے اور میری نگاہیں بے اختیار
گنگو کی دوکان کی طرف اٹھیں ....
"دل بہار شربت" ... بالکل نیا بورڈ ... جھنڈیاں لگی ہوئیں
.... دُکان کے سامنے چھڑکاؤ ... ایک خوبصورت شامیانہ ...

اور شامیانے کے نیچے باہر بھی کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ..... برف ایک بڑی سی سِلّی پر رنگ برنگی بوتلیں۔ سنترے اور نیبو سجے ہوئے ...

میں حیران ... پریشان ... یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ....

آگے بڑھا اور گنگو کی دکان کے سامنے پہنچا ..... سر میں چمیلی کا تیل لکھنوی کرتا چکن کا .... چارخانہ دار .... ریشمی تہبند۔ مونچھیں قاعدے سے ترشی ہوئیں ... گاؤ تکیہ لگائے گنگو ایک شانِ دلربائی سے بیٹھا ہوا تھا ....

میں ابھی حیرت کے سمندر میں غوطے کھا ہی رہا تھا کہ اچانک گنگو کی نظر میری طرف اٹھی .... جیسے بجلی کا شاک لگا ہو ..... وہ بائیں ہاتھ سے اپنی توند پر سے پھسلتا ہوا ریشمی تہبند سنبھالتا ہوا اٹھا ....

"بابو جی کب آئے؟" اس نے دور سے ہی دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"کل رات آیا تھا ... تم تو اچھے رہے؟"

آپ کی دعا ہے بابو جی ... آپ کے بغیر محلہ سونا تھا ... وہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ... گرمی تو زیادہ نہیں تھی ... ادھر ادھر کی باتیں .....

میری نگاہیں دوکان کا جائزہ لیتی رہیں .....

نئی الماریاں ... نیا فرنیچر، ہر شے کا چہرہ رنگ و روغن سے نکھرا ہوا .... ہر شے سے نفاست اور صفائی ٹپکتی ہوئی ....

دوکان کے وسط میں ایک مونڈھے پر ایک نوجوان لڑکی ... سانولا رنگ ... ہلکی سی لپ اسٹک ساری کے گلابی رنگ سے میچ کرتی ہوئی ... لمبے لمبے بالوں کی ڈھیلی گندھی ہوئی

دو چوٹیاں جن میں گلاب کے پھول مہک رہے تھے۔۔۔

میری سوالیہ نگاہیں گنگو کی طرف اٹھیں۔۔۔

گنگو نے میری نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے رازداری سے کہا۔۔۔

بابو جی! جرا دوکان کی ماہوری کے لیے بٹھا دی ہے۔۔۔

مگر یہ ہے کون؟۔۔۔ میرا گلا خشک تھا

اپنی ہی لونڈیا ہے۔۔۔

میرا مطلب ہے تمہاری لڑکی۔۔۔۔؟

ہاں بابو! کچھ اپنی ہی سمجھ لو۔۔۔

میں گنگ ہو کر رہ گیا۔۔۔

آپ کبھی تشریف نہیں لاتے۔۔۔

گنگو نے پہلی مرتبہ شکایت کی۔۔۔

میری نگاہیں دوکان کے وسط میں اٹھیں۔۔۔

لڑکی نے مسکرا کر آنکھ ماری۔۔۔

اور میں کچھ سوچتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔۔۔

پیش بندی

مگر تم تو اس سے بہت شدید قسم کا عشق کرتے تھے.....
اگر عشق شدید ہو سکتا ہے تو کرتا ہوگا۔ کچھ ٹھیک سے یاد نہیں . . .

واہ رے میرے مٹی کے شیر! کامن روم میں دن بھر باتیں ہوتی تھیں۔ لائبریری میں پہلو بہ پہلو بیٹھتے تھے۔ سینما، پارک، پکنک، کینٹین... آخر کہاں، کہاں تم لوگ ساتھ نہیں تھے، جب دیکھو یک جان دو قالب نظر آتے تھے، آخر اور کیا شدت ہوتی ہے عشق میں.....

اگر اس کا نام شدید عشق ہے تو مجھے اعتراف ہے کہ میں کافی شدید قسم کا عاشق تھا....

ارے وہ تو میں بھی جانتا ہوں... مگر پوچھ تو یہ رہا ہوں کہ اس کو دیمک کس طرح لگ گئی؟...

بیکار رکھے رکھے چیزوں کو دیمک لگ ہی جاتی ہے . .

تو یہ عشق کب سے بیکار تھا . . . .

جب سے میں کشمیر گیا . . .

یعنی پانچ سال سے . . . .

ہاں !

تو اس دوران میں کوئی خط وکتابت بھی نہیں ہوئی . . . . ؟

ہوئی کیوں نہیں . . . بلکہ ملاقاتیں بھی ہوئیں . . .

تفصیل بیان کی جائے . . . .

کہا جاتا ہے کہ جب میں فکر معاش میں کشمیر آیا تو وہ بہت روئی ۔ اسکی خوبصورت ، موٹی ، موٹی آنکھیں سوج گئیں . . . دروازہ تک ایک ہی درخواست تھی کہ مجھے برابر خط لکھئے گا ۔ اپنی صحت کا خیال رکھئیگا ۔ مجھے بھی نہ معلوم اخلاقاً ، ضرورتاً یا شاید حقیقتاً اداس ہونا پڑا ، کسی خوبصورت لڑکی کو اداس دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے میری دنیا لٹ گئی . . . . مختصر یہ کہ میں سوگوار حسن پر جان دیتا ہوں ۔ اس لیے حضور اگر رازداری کا وعدہ کریں تو مجھے اس سے محبت ہی اس روز ہوئی جب وہ مجھے جاتے دیکھ کر روئی . . . .

میں مری نگر پہنچ گیا . . . دور جگہ تھی . . . اور چونکہ میں نیا نیا گیا تھا اس لیے سوشل لائف بھی کچھ نہیں تھی . . . . میں نے اسے بہت یاد کیا . . جتنا یاد کرتا تھا ، اتنے ہی خط لکھتا تھا . . اور جتنے خط لکھتا تھا اتنا ہی شاعری کا موڈ آتا تھا اور جتنے اشعار نازل ہوتے تھے اتنی ہی محبت تیزی سے ترقی کر رہی تھی . . .

وادیٔ کشمیر کی دلفریب راتیں ، الفت کی اس آگ کو ہوا دیتی رہیں . . . مگر چونکہ علاقہ سرد ہے ، اس لیے میں اس کی یادیں مستقل گرم آہیں بھرتا رہا . . . . پھر میں چھٹی پر آیا ، . . . عہد و پیمان تازہ ہوئے . . . . زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کی قسم کھائی گئی . . . .
میں نے عرش سے تارے توڑ لانے کی پیشکش کی اس نے مسکرا کر شکریہ ادا کرتے ہوئے جنم جنم میرا پیچھا کرنے کی دھمکی دی . . . کیوں نہ ہو دس مہینے ایک دوسرے سے الگ رہنے کے بعد ملے تھے . . . یوں بھی دیگر احباب اور رشتہ داروں سے ملاقات ہوئی ۔ اور اس طرح چھٹیوں کے دو مہینے ہوا کی طرح گزر گئے . . . اور میں یہی سوچتا رہا کہ شاید میں سچا عاشق ہو گیا ہوں . . . جبھی تو ملن کی گھڑیاں ہوا کے ایک جھونکے کی طرح بیت گئیں . . . اور پھر جدائی کی دس مہینے لمبی رات آ گئی . . . .

خطوں کی بارش اور تیز ہو گئی . . . تصویروں کے تبادلے ہوئے . اور پھر کافی طویل عرصہ تک یہ گھٹا برستے برستے مدھم سی ہونے لگی ، شاید الفاظ کا خزانہ خالی ہونے لگا تھا . . . یا پھر وہی خالی کھوکھلے اور پرانے الفاظ دہراتے ہم تھک چکے تھے . . . اور اُسے شکایت ہوئی تم بدلنے لگے ہو . . . اس بار تم نے مجھے چاند سورج نہیں لکھا . . میری مانگ کہکشاں سے نہیں سجائی . . . شفق کی لالی چرا کر میرے خشک ہونٹوں کو نہیں بخشی . . . خط بہت مختصر تھا . . . بہت بے دلی سے لکھا ہوا . . . .

اور میرے جواب جاتے رہے . . . . اب تم مجھے اپنے مستقبل کا سہانا خواب نہیں سمجھتیں . . . میرا قد تمہیں چھوٹا کیوں محسوس ہوتا ہے . . .

میری شاعری کو تم غیر فطری کیوں کہتی ہو... میں اچھا ان باپ سے بیوقوفی کی حد تک مانوس ہوں... ایسا تم نے کیوں لکھا...؟

مگر پھر ملن کے دن آ گئے... عہد و پیماں پھر سے دہرائی گئیں کیے گئے... ملاقات کی مٹھاس نے چند لمحوں کے لیے شکایتوں کی تلخیوں کو مٹا دیا... پرانے اشعار سے گرد جھاڑی گئی... چاند سورج کی تشبیہات کو آکسیجن دی گئی... مگر یہ خوشی خطوں کی طرح مختصر ثابت ہونے لگی... اور پھر سے شکایتیں کروٹ بدل بدل کر بیدار ہونے لگیں... آپ کچھ بدل سے گئے ہیں... کہتے ہیں کشمیر بہت خوبصورت جگہ ہے... اور سُنا ہے لوگ بھی کافی خوبصورت ہیں... اتنے دن ہو گئے آپ کا ضرور کسی پر دل آ گیا ہوگا...

میں یہ باتیں سُن کر الگ کڑھتا رہا... کسی خوبصورت لڑکی پہ دل آجائے کا حسین الزام تو سر آنکھوں پہ... مگر افسوس تو اس بات کا تھا کہ یہ پیارا خواب کبھی حقیقت کے دریچوں سے نہ جھانک سکا... دل ترستا ہی رہا... مگر کسی خوبصورت لڑکی کے کان پر جوں نہ رینگی۔ اور رینگتی بھی کس طرح، آج کل کی لڑکیاں سر کی صفائی کا خوب خیال رکھتی ہیں...

جدائی کے دن ایک بار پھر آئے... آنکھوں میں اس دفعہ آنسو تو نہیں تھے مگر ان میں ہلکی سی سرخی ضرور تھی... خدا معلوم وہ سرخی ہی تھی کہ اس روز ضرور تا پیاز کی چٹنی بنائی گئی تھی... انھوں نے محبت سے میرا ہاتھ ہاتھ میں لیا، اور اداس ہونے کی پوری کوشش کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا... مجھے امید ہے آپ میرے

پرانے عشرت بن جائیں گے ...

میں اب بھی وہی ہوں ... تم شاید بدلنے لگی ہو .. یا تمھارے چشمہ کا نمبر بدلا گیا ہے ... بہرکیف غلطی کہیں نہ کہیں ضرور ہے ... آؤ آج ہم ٹھنڈے دل سے دعا کریں کہ یہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں ... اور جنم جنم سے محبت کرنے والی دو عظیم روحیں پھر سے ایک ہو جائیں ......

ڈیر! کیا آپ کی تنخواہ نہیں بڑھ سکتی .. سنا ہے سری نگر کافی مہنگی جگہ ہے ... ڈھائی سو روپئی میں کس طرح گزارہ ہوگا۔ دو محبت بھرے دل تو ایک وقت کھا کر بھی گزارہ کر سکتے ہیں .. مگر ڈیر یہ تو پلین (Plain) کی محبت میں ہوتا ہے جہاں انسان دن میں صرف دو بار کھاتا ہے ... پہاڑوں پر تو بھوک زیادہ لگتی ہے ... انسان چار وقت بھی کھا سکتا ہے ....

بات معقول تھی ... اور میں سوچنے لگا ... سوچتا رہا ... یہاں تک کہ پچھلی یادوں کی طرح بال بھی ساتھ چھوڑنے لگے، میں بہت تیزی سے "فارغ البال" ہو رہا تھا ... گھبراہٹ اس دور کے بیشتر نوعمر گنجوں کی طرح شباب پر تھی ... زندگی بھر ٹوپی نہیں پہنی ... اور سچ مانئے تو کبھی اس کا مصرف سمجھ میں نہیں آیا۔ کبھی عید، بقرعید کی نماز پڑھنی بھی ہوتی تھی تو رومال سے کام چل جاتا تھا ... مگر واہ رے بالوں کی خزاں ... ٹوپیوں کی خوبیاں اچانک سامنے آگئیں ... اور میں اس بابرکت ٹوپی کا پہنتا اور دعاؤں سے منھ بھرے میرٹھ پہنچا ...

میرے سر پر ٹوپی دیکھ کر وہ مسکرائیں...
کہیے! یہ کیا ڈھونگ ہے... ہاں بیچارے کشمیر کے لوگ
سادہ لوح ہوتے ہیں جس طرح چاہو ان کو بہکالو۔ مگر خدا کے
لیے یہاں تو اس ٹوکرے کو سر سے اتارو.. مجھے تو خفقان ہورہا
ہے... میری ٹوپی ڈرتے ڈرتے عالم بالا سے زمین پر آئی..
اور ان کے منھ سے بے اختیار نکلا——
اوئی اللہ آپ تو بالکل گنجے ہو گئے....
بالکل تو نہیں ڈیر! ہاں کچھ تھوڑے بہت بال کم ہو گئے ہیں
وہ بھی صرف تمہارے فراق میں...
مارو گولی ایسے فراق کو——اچھی بھلی صورت ہی بگاڑ کر رکھ دی ہے..
صورت تو بقول اُن کے بگڑ ہی چکی تھی... میں نے اپنی محبت سے
متاثر کرنے کے لیے کہا.. میں تو تمھاری محبت میں اکثر رات گئے
سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہوں... گھر تمہارے بغیر جیسے کاٹ کھانے
کو دوڑتا ہے....
اچھا جی! اب آوارگی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ گھر میں بیٹھنے
کو بھی دل نہیں چاہتا....
غرضیکہ محبت کے نقرئی پردے چاک ہونے لگے تھے... میں نے
پھر ڈرتے ڈرتے چاند ستارے لانے کو کہا... تو انھوں نے
جل بھن کر کہا... میں ان نگوڑمارے چاند ستاروں کو سر سے ماروں گی
... نہ جانے کب سے کہہ رہی ہوں کہ ایک کشمیری سلک کی اچھی سی
ساری لادو....

دل کو پھر سے سنبھالا... اور ادب سے عرض کیا...

ساڑھیاں تو میں دو لاکر دے چکا ہوں

انکے مزاج کا پارہ ایک دم عرش معلیٰ پہ پہنچ گیا اور تقریباً چیختے ہوئے

فرمایا... ہاں میری تو ایک ایک چیز کا حساب رکھا جاتا ہے... بڑا

کرم کیا... دو ساڑھیاں لائیں... مگر ان نیستی ماری ساڑھیوں میں

سے ایک بھی اس لائق نہیں جو پہنی جا سکے... ان کا موڈ اور غصہ دیکھ کر

اب مجھے یہ کہنے کی ہمت نہیں پڑی کہ نہ جانے کب سے میں آپ کو وہی ساڑھیاں

استعمال کرتے دیکھ رہا ہوں... وہ خود ہی کہتی رہیں...

یاسین بھائی کو دیکھئے... کیا کیا خوبصورت چیزیں خرید کر لاتے

ہیں۔ مجھے ایک ساڑی لا کر دی... میں تو ان کے انتخاب اور رنگوں کے

سلیقہ کو مان گئی... میں نے ایک بار پھر حواس مجتمع کرتے ہوئے کہا...

کبھی میری لائی ہوئی چیزیں بھی تو آپ کو پسند آتی تھیں...

اول تو آپ لاکر ہی کیا دیتے ہیں... اور اگر کبھی بھولے بھٹکے بلی کے

بھاگوں چھینکا ٹوٹ گیا... تو دیکھ کر دل ہی جل جاتا ہے...

مگر پہلے تو آپ بہت تعریف کرتی تھیں

وہ تو یونہی دل رکھنے کے لیے کہہ دیتی تھی

تو اب دل کیوں نہیں رکھتیں...

میں سمجھتی تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ آپ کو سلیقہ آجائیگا... مگر آپ تو...

کہہ دیجئے کہ پیدائشی بیوقوف ہوں... میں نے تقریباً آگ بگولہ ہو کر کہا...

خیر یہ میں کس طرح کہہ سکتی ہوں۔ آپ تو خود بہتر سمجھتے ہیں۔

مگر ہاں یہ طے ہے کہ امتحان پاس کرنا بالکل دوسری بات ہے۔ اور

دنیا کا تجربہ اور سلیقہ بالکل دوسری بات . . .

یوں تو یاسین بھائی اس سال B.A. میں فیل ہو گئے ہیں . . .
مگر کیا سلیقہ ہے پہننے اور گفتگو کرنے کا . . . سچ میں بات کرتے ہیں
تو پھول جھڑتے ہیں . . .

میں خطرہ کی گھنٹی سن چکا تھا . . . اس لیے یہ کہتا ہوا اُٹھ آیا . .
ہاں اب اُن جھڑتے ہوئے پھولوں میں اُن کانٹوں کا کیا کام . . . .

میں کئی روز تک ناراض بیٹھا رہا . . . اس امید پر کہ اب وہ اپنے
کیے پر پچھتاتی ہوگی . . . اور اپنے رویے پر نادم ہو کر مجھے بلانے بھیجے گی
مگر ان کی ندامت شرمندۂ احسان نہ ہوئی کہ ہمارے جانے کے دن قریب
آ گئے . . . آخر کار ہم نے ہی جھک جانے کا فیصلہ کیا . . . اور ان سے
ملنے پہنچے . . . انھوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا جیسے کہ پوچھ رہی
ہوں . . . حضرت اب یہاں کیا لینے آئے ہو . . . یہ دوکان تو بڑھ چکی
. . . میں نے ان کے تاثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا . . .

"میں جا رہا ہوں . . .

"کیا ہمیشہ کے لیے . . . انھوں نے دریافت کیا اور آنکھوں میں آنسو
بھر لانے کی کئی بار ناکام کوششیں کیں اور میں نے اُن کی مشکلات کا اندازہ
کرتے ہوئے بار بار منھ پھیر لیا . . . تاکہ وہ خشک آنکھوں کو مزید خشک کر کے
یہ ثابت کر سکیں کہ آنسو ہیں کہ اُمڈے چلے آ رہے ہیں . . .

کشمیر کے شب و روز ہر سال کی طرح جوان تھے . . . میں نے پہلی بار
اپنے گرد و پیش کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا . . . تو مجھے خواہ مخواہ اپنے
مستقل اداس رہنے پر اداس ہونا پڑا . . . اور مجھے پہلی مرتبہ اندازہ

ہوا کہ اس زندگی میں میرے لیے بھی کافی مشغولیتیں تھیں ... پھر میری
کتابیں اور پُر خلوص محبت سے اکتا چکی تھیں ... اور میں ... میں اپنے
خلوص پر پشیمان تھا ... کبھی بھولا بھٹکا خط آجاتا تھا ... ادھر
میری زندگی بھی رفتہ رفتہ نئی راہوں میں سنورنے لگی تھی ... مگر اگر
انھیں بھولا نہیں تو تقریباً بھول سا ضرور گیا تھا ... اور یہ میرے لیے
کافی تھا ... ان کے بھولے بھٹکے خطوں سے لیٹین صاحب کے ارتقاء
کی اطلاع ملتی رہی ... وہ پہلے لیٹین صاحب تھے ... پھر لیٹین بھائی بنے
اور اس کے بعد لیٹین رہ گئے ... مجھے ان کے لیٹین ڈیر بننے کا انتظار تھا کہ
ان کی شادی کا کارڈ ملا ... جو شادی کے بعد پوسٹ کیا گیا تھا .....
اگرچہ شادی کے خط پہ تاریخ شادی سے پہلے ہی کی تھی مگر وہ تو خدا بھلا کرے
ڈاکخانہ کے مُہر ڈالنے کے دستور کا جو مجھے اس راز سے آگاہی ہوئی ...
مگر میں نے اس رازِ سربستہ سے جو نہ ان کے لیے راز تھا اور نہ میرے لیے
پردہ اٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی ... مبارکباد کا خط لکھا،
ڈاکخانہ والوں کو بے قصور سوچا ... اور ان کے آخری خط کی آخری درخواست
کا ذکر گول مول الفاظ میں کر دیا کہ آپ فکر نہ کریں، آپ کے خطوط جو عشق،
محبت، خلوص اور لگاوٹ کے خوبصورت رنگوں سے مرصع ہیں وہ تلف
کر دیے جائیں گے، اور آپ اپنی محبت اور پیار کا یقین اپنے پیارے شوہر کو
جس رفتار اور شدت سے چاہیں دلا سکتی ہیں ... مجھے ان کی
شادی کا اگرچہ بالکل افسوس نہیں ہوا ... مگر رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ
اب میری چھٹیاں ہونے والی ہیں ... بہت ممکن ہے کہ ان سے ملاقات
ہو ... اور اس اچانک ملاقات پر وہ کس قدر محجوب ہوں گی اور میں ان کی

اداس پشیمان اور جھکی ہوئی نظریں کس طرح دیکھ سکوں گا۔۔۔

داستان ختم ہوئی۔ آپ کو کچھ اور پوچھنا ہے۔۔۔

ہاں!! مگر اس سے پہلے ہم کچھ اور پوچھیں۔ ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ما بدولت تمہارے انداز بیان سے بہت متاثر ہوئے۔۔۔ اگر ہم پرانے زمانے کے بادشاہ ہوتے تو تمھیں اسی وقت خلعت فاخرہ سے سرفراز فرماتے اور وظیفہ شاہی عطا فرما کر تمھارا منھ موتیوں سے بھر دیتے۔۔۔ مگر فی الحال ہم اپنی بے روزگاری کے ہاتھوں خود ہی مجبور ہیں۔۔۔ بہر کیف اس خوبصورت مگر غم انگیز غزل کا مقطع تو سنا دیجئے۔۔۔

مقطع؟

ہاں کیا اُن سے اس بار ملاقات ہوئی۔۔۔

ملاقات ہوئی۔ نظریں ملیں۔۔ میں منتظر رہا کہ وہ شرما کر اب گردن جھکائیں اور اداس ہو کر کہیں۔ مجھے افسوس ہے عشرت۔۔۔ میں اس زمانے کے بیدرد پھندوں سے خود کو نہ بچا سکی۔۔۔ اور جیون کے اس سفر میں تمہاری شریک حیات نہ بن سکی۔۔۔ مگر کوئی بات نہیں۔۔۔ ہم اچھے دوست رہیں گے۔۔۔ مگر جب ان کی بے باک نظریں فخر سے میرے او پر جمی رہیں تو میں نے اخلاقاً شرما کر سر جھکا لیا۔۔۔

کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔۔۔

ہاں ہوئی۔۔۔ ان کا حملہ پھر ایک بار میرے سر پر ہوا۔۔۔ بولیں۔۔ آپ کے بال کچھ اور کم ہو گئے ہیں۔۔۔

تم نے کیا جواب دیا؟۔۔۔

میں نے کہا۔۔ جی ہاں روز بروز عقل مند ہو رہا ہوں۔۔۔ آپ تو جانتی

ہیں کہ میں ازلی بیوقوف ہوں ۔۔۔۔

انھوں نے مسکرا کر بجلیاں گراتے ہوئے کہا ۔۔۔

مجھے یٹین کے بال بہت پسند ہیں ۔۔۔

اور پھر میں نے دریافت کیا ۔۔۔ کیا واقعی آپ کو بالوں سے بہت

یادہ پیار ہے ۔۔۔

فرمایا ۔۔۔ اپنی زندگی سے بھی زیادہ ۔۔۔ آپ جانتے ہیں کہ جب

پ کے بال کم نہیں ہوئے تھے ۔۔۔ تو میں آپ سے کتنا پیار کرتی تھی ۔۔۔۔

ں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکا ۔۔۔ مگر نہایت ادب سے کہا ۔۔۔

گر آپ نے شادی کرنے میں ذرا جلدی کی ۔۔۔ اگر اس خواہش کا اظہار

پ پہلے فرما دیتیں تو میں آپ کو نہایت عمدہ رشتہ بتاتا ۔۔۔

تو اب بتائیے نا ۔۔۔ پلیز ۔۔۔ انھوں نے اپنی آواز میں خوشامد

ی شکر گھولتے ہوئے کہا ۔۔۔

میں نے ادب سے عرض کیا ۔۔۔

میرے ایک دوست کے پاس انتہائی خوبصورت گوریلا ہے ۔۔۔

ور اس کے تمام جسم پر نہایت خوبصورت بال ہیں ۔۔۔

ما بدولت خوش ہوئے تمھاری ذہانت پر ۔۔۔ اُن پر کیا گذری

وہ خفا ہو کر چلی گئیں ۔۔۔ اور اب کبھی کہیں ملتی بھی ہیں تو منہ پھلا لیتی

ہیں ۔۔۔ مگر جس محفل میں وہ بھی ہوں اور میں بھی تو یٹین کے خوبصورت

بالوں کا ذکر ضرور جنم لیتا ہے ۔۔۔۔

آخر بال ان کے اعصاب پر اس قدر سوار کیوں ہیں ۔۔۔۔

وہ یوں کہ بد قسمتی سے محبت کے ان طویل سالوں میں میرے اندر اور تو

کوئی خاص تبدیلی ہوئی نہیں ۔ بلکہ دنیا کی نظر میں تو میں نے ترقی ہی کی ہے سوائے اس کے کہ کچھ بال دغا دے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ انھیں لیسین پسند آ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس میں وہ اور کوئی خوبی تو دیکھ نہیں پائیں ۔ جس کی بنا پر وہ اسے مجھ پر ترجیح دے سکتیں ۔ ۔ ۔ آخر انھیں مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے کوئی جواز تو چاہیئے تھا ۔ ۔ ۔ اور جیسا کہ تم جانتے ہو کہ ایک بیوقوف آدمی ساری دنیا کو بے وقوف سمجھتا ہے ۔ ۔ ۔ وہ مجھے یہ یقین دلانا چاہتی ہیں کہ انھوں نے لیسین کو صرف اس لیے پسند کیا ہے کہ اس کے سر پر بال زیادہ ہیں ۔ اور یہ پیش بندی صرف اس لیے ہے کہ میں یہ اندازہ نہ کر سکوں کہ چاہے اس کے سر پر بال زیادہ ہوں یا نہ ہوں مگر اس کی جیب میں پیسے ضرور زیادہ ہیں ۔

———✲———

برف اور خون

اور اپنیشر سنگھ کو ایک دم ایسا لگا جیسے اُس کے جسم سے گرم گرم لاوا بہنے لگا ہو۔ ۔ ۔ تا حدِ نظر پھیلی ہوئی برف پر اس کی نظریں ایک لمحہ کے لیے ٹھہریں اور پھر اندھیروں میں ڈوب گئیں۔ ۔ ۔ اس نے تازہ پڑی ہوئی برف کو مٹھی میں بھینچ کر اس اُبلتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہا جو اس کے جسم کے بے شمار گوشوں سے بہہ رہی تھی۔ ۔ ۔ مگر اس کا ڈوبتا ہوا ذہن کسی مقام پر نہ ٹھہر سکا۔ ۔ ۔ اور اُسے ایسا لگا جیسے کسی نے اُسے آسمان کی بلندیوں سے نیچے پھینک دیا ہو۔ ۔ ۔ وہ گر رہا تھا اور کوئی شے تیزی سے اس کے گرد گھوم رہی تھی۔ ۔ ۔ نہ جانے کتنے پہاڑ، کتنی سر بفلک عمارتیں اس کے راستے میں آئیں اور اس نے بے اختیار ان کو اپنی گرفت میں لینا چاہا۔ ۔ ۔ مگر ہر شے موم کے بے حس ٹکڑوں کی طرح دب کر ٹوٹ گئی۔ ۔ ۔ وہ گرتا رہا۔ ۔ ۔ کائنات کے نشیب و فراز میں ہچکولے لیتا، اوپر نیچے نیچے اوپر۔ ۔ ۔ اور اس کی ایک بے اختیار چیخ اندھیروں میں گھٹ کر رہ گئی۔

اور جب اُس نے برف کی گود میں آنکھیں کھولیں تو اسے ایسا لگا جیسے کوئی اس کی ٹانگوں کا قیمہ کیے ڈالتا ہو... اس نے بیہوشی کے اثرات جھٹک کر ٹانگوں کو ہلانا چاہا... مگر اسے اس نتیجہ پر پہنچتے دیر نہیں لگی کہ اب وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکیگا۔ اُس کی دونوں ٹانگیں بالکل بیکار ہو چکی تھیں... اس کی ہتھیلیاں جل رہی تھیں اور ہونٹ خشک تھے... اس نے نحیف ہاتھوں سے تھوڑی سی برف اٹھا کر منہ میں رکھنا چاہی۔ مگر اس میں اپنے خون کی گلابی جھلک پا کر وہ ناخنوں سے برف کریدنے لگا... ایک دفعہ ہمت کر کے اس نے تباہ شدہ ٹانگوں کی طرف دیکھنا چاہا... مگر اس خیال سے ہی اسے پھریری آ گئی...

"ہماری چوکی کا کیا ہوا"... قوتِ احساس کے بیدار ہوتے ہی اس کے ذہن میں ایک سوال ابھرا... وہ ایک ایسی ڈھلان پر پڑا ہوا تھا، جہاں سے اسے اپنی چوکی نظر نہیں آ رہی تھی۔ "میرے ساتھیوں کا کیا ہوا... شاید وہ میرے واپس نہ لوٹنے پر اس فارورڈ پوسٹ کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے ہوں یا پھر وہ بھی اسی کی طرح اچانک حملہ کا شکار ہو کر جان پر کھیل گئے ہوں..."

ایشور سنگھ کل ہی سمجھ گیا تھا کہ دشمن ہمیں Out flank کر کے تین طرف سے گھیر رہا ہے... سپلائی لائن قائم رکھنے کے لیے یہ بے حد ضروری تھا کہ اس کی کمپنی اس فارورڈ پوسٹ کو خالی نہ کرے... اس لیے دشمن کو اپنی پوسٹ سے دور ہی انگیج کرنا بیحد ضروری تھا تا کہ انھیں اس پوسٹ پر سپاہیوں کی صحیح تعداد اور طاقت کا اندازہ نہ ہو سکا... اور اس نے سپیدۂ سحر نمودار ہونے

کے ساتھ ساتھ ہی اس چھوٹی سی چٹان کی آڑ میں دو طرف سے امجد اور وہ دستی بموں سے دشمن کو ہراساں کرنا چاہتے تھے۔۔۔ بحیثیت افسر اس نے یہ جوا کھیلا۔۔۔۔ "امجد کا کیا ہوا۔۔۔
شاید وہ بھی۔۔۔۔
نہیں وہ نہیں مر سکتا۔۔۔
اسے نہیں مرنا چاہیئے۔۔۔۔
ابھی تین مہینے پہلے تو اس کی شادی ہی ہوئی تھی۔۔۔ اور اس نے کئی بار دیکھا کہ وہ نظریں بچا کر اپنا پرس نکال کر بیوی کی تصویر کو بار بار دیکھا کرتا تھا۔۔۔۔
اس کے دستی بموں نے دشمن کو سراسیمہ کر دیا تھا۔۔۔ مگر ایک جوابی بم اس کے قریب آگرا تھا۔۔۔ اور پھر۔۔۔ اس نے ایکبار پھر ہمت کر کے کروٹ لینی چاہی تاکہ وہ کچھ دور پھسل کر اس چٹان کے دوسری طرف کے حالات کا جائزہ لے سکے۔۔۔ مگر اس کی ٹانگوں نے جواب دیدیا۔۔۔ اور ایک بے اختیار کراہ اس کے لبوں پر آکر ٹوٹ گئی۔۔۔
میری ٹانگیں۔۔۔۔ اسے اپنی ماں یاد آگئی جو اپنی مفلوج ٹانگیں سنبھالے پہیوں والی کرسی میں بیٹھی سارے صحن میں چکر لگاتی پھرا کرتی تھی۔۔۔ ماں لے تو میری ٹانگیں لے لے۔۔۔ آخر میں تیری اولاد ہوں۔۔۔ اور کس دن کام آؤں گا۔۔۔
ماں پیار بھرے غصہ میں جھنجلا اٹھتی۔۔۔!
میرے لال! ایسی بد فال منہ سے نہ نکال۔۔۔ میں کوئی ڈائن ہوں جو اپنی آنکھوں کے تارے کی ٹانگیں لونگی۔۔۔

مگر جب وہ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے حسرت بھری نظر دل سے ادھر اُدھر نکلتی تو ایشر سنگھ کو اپنی ٹانگیں ایک زبردست بوجھ محسوس ہوتیں۔۔ ایک ایسا بوجھ جو آج ادھ جلے گوشت کے لوتھڑوں اور ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کی صورت میں اس کے جسم سے لپٹا ہوا تھا۔۔۔۔

درد کی ایک شدید لہر اس کی ٹانگوں سے اُبھری۔۔۔ اور اس نے دفورِ کرب سے اپنے ہونٹوں کو کاٹتے ہوئے سوچا۔۔۔ ماں! آخر تو مان ہی گئی۔۔۔ آخر کب تک حسرت سے اس طرح دور دروں کی طرف تکتی۔۔۔۔ اپنے لال کی بات مان لی تو نے۔۔۔ ماں! میری پیاری ماں! اس نے پُرسکون ہو کر اپنا جلتا ہوا چہرہ برف پر رکھ دیا۔۔۔ جیسے وہ تھک کر ماں کی گود میں سونے لگا ہو۔۔۔

اس چٹان کے عقب سے ایک سرسراہٹ اُبھری۔۔۔ ایشر سنگھ چونک گیا۔۔۔ ایک نئی قوت اس کے اعصاب میں جاگی اور اس نے لیٹے ہی لیٹے اپنی برین گن سنبھالی۔۔۔ ہورسیک سے نکال میگزین فٹ تھا۔۔۔ اور اس کی نال اُبھرتی ہوئی سرسراہٹ کی طرف دیدے احتیاط سے دیکھ رہی تھی۔۔۔۔

"تھم" اس نے سرسراہٹ کو کافی قریب محسوس کر کے اپنی پوری قوت سے کہا۔۔۔

"دوست"! آواز چٹان کے عقب سے آئی تھی۔۔۔ اور چند لمحہ بعد ایک آدمی اس کے سامنے تھا۔

ہماری چوکی کا کیا ہوا۔۔۔ ایشر سنگھ نے بے اختیار پوچھا۔۔۔

وہ ہمارے قبضہ میں ہے ... دشمن کی تین طرف سے گھیرا ڈالنے
کی کوشش ناکامیاب ہو چکی ہے ....
شاباش .... مگر تم یہاں کیوں آئے ....
آپ کو دیکھنے ....
نہیں ... تمہیں اس طرح اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے تھا
میری جان آپ سے زیادہ قیمتی نہیں ہے ... آئیے ... آپ میرے ساتھ
کچھ دور گھسٹ چلیں ....
پاگل نہ بنو ... سامنے اس چھوٹی سی پہاڑی پر دشمن موجود ہے ...
ورنہ وہ مزدور ہمارے سر پر پہنچنے کی کوشش کریگا ... تم وقت ضائع کیے بغیر
فوراً چلے جاؤ ...
مگر آپ !
میں اب تم لوگوں کے لیے مر چکا ہوں ...
ایسی بات آپ منھ سے نہ نکالیں ... آپ کی ٹانگیں زخمی ہیں ...
ٹھیک ہو جائیں گی ....
دیکھو امجد ! میں اگر بالکل ٹھیک بھی ہوتا تو بھی واپس نہ جاتا ...
میں اپنی چوکی اور دشمن کے بیچ ایک اور دیوار ہوں ... ان کی پیش قدمی
روکنا ہماری سپلائی لائن کو قائم رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے ....
تم جاؤ اور اپنے ساتھیوں کو میرا یہ پیغام دیدو کہ یہ میرا خون ...
جو اس برف میں رچ گیا ہے ... دشمن کے ناپاک قدموں تلے نہ آنے پائے ...
مگر آپ کو یہاں اس حالت میں چھوڑ کر ...
ایشر سنگھ آواز سخت ہو گئی ...

امجد! تم وقت ضائع کر رہے ہو ... موت کے سرد ہاتھ خلا
کے طوق سے کہیں بہتر ہیں ... بس اب جاؤ .... میں بحیثیت
تمھیں حکم دیتا ہوں کہ تم مورچہ پر واپس جاؤ اور دشمن کا مقاب
امجد نے ایک حسرت بھری نگاہ ایشر سنگھ پر ڈالی اور جانے کے
مڑا .... وہ رینگتے رینگتے ابھی آدھے راستہ ہی پہنچا تھا کہ ا
کے قریب چند گولیاں برف میں دبی ہوئی چٹان سے ٹکرا کر فضا
بکھر گئیں ... اس نے تیزی سے اپنا رخ بدلا اور گولیاں برسا
ہوئے دشمن کے خلاف پوزیشن لی ... اس سے پہلے کہ اس
دہ قفل آگ اگلتی۔ اس نے دیکھا کہ دشمن کے کئی سپاہی ٹوٹے ہو
کھلونوں کی طرح پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکتے ہوئے آ رہے ہیں ...
وہ ایک لمحہ کے لیے چونکا، مگر پھر خاموشی سے لیٹا ہوا اس وق
تک دیکھتا رہا۔ جب تک ایشر سنگھ کی برین گن آگ بم سا تے برسا
اچانک نیند کی گود میں سو گئی ....

—×—

موٹی ناک

میں سر جھکائے بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ ایک شرمیتی جی وارد ہوئیں اور کملا دوڑ کر لپٹ گئی

میری اچھی شانتی!

اور میں نے اپنی شانتی بھنگ کرنے والی شانتی کو دیکھا....

گورے چٹے رنگ کی ایک جوان لڑکی کملا سے ہم آغوش تھی....

خد و خال نہایت متناسب، قد نہایت موزوں... مگر... مگر میری نگاہیں اس کی موٹی ناک سے ٹھوکر کھا کر لوٹ آئیں..... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جب شانتی کا اسکیچو زیر تشکیل تھا اور صناع فطرت اسے تقریباً تیار کر چکا تھا اور صرف ناک کو Finishing touch دینا باقی تھا تو شانتی جی کا اس اشانت سنسار میں آنے کا سمے آگیا ....اور اس نے کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر اسے یونہی دنیا میں بھیجدیا۔

خیال اچھا ہے.... میں نے مسکراتے ہوئے سوچا

اور کملا شانتی سے بولی۔ ۔ ۔ "چلو دوسرے کمرے میں بیٹھیں گے۔ ۔ ۔
وہ دونوں چلی گئیں
۔ ۔ ۔

بالکل عجیب بات ۔ ۔ ۔ کملا نے مجھ سے متعارف بھی نہ کرایا ۔ ۔ ۔ شاید
وہ مجھے ڈسٹرب نہ کرنا چاہتی ہو۔ کیونکہ بظاہر میں کتاب میں غرق تھا۔
"ہم دونوں بنارس میں ساتھ پڑھتے تھے ۔ ۔ ۔ میرے جانے بوجھے
سرسری سے استفسار پر کملا نے بے تعلقی سے کہا ۔ ۔ ۔ اور کچھ اس انداز
سے کہا کہ میں مزید تحقیق بھی نہ کر سکا۔

اس کے بعد شانتی متعدد بار ہمارے گھر آئی ۔ ۔ ۔ یا جب کملا گھر سے
غائب ہوتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ شانتی کے یہاں ہے ۔ ۔ ۔ مگر نہ جانے
کملا کو ان دنوں کیا ہو گیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اگر شانتی کا ذکر کرو تو وہ ایک کان
سن کر دوسرے سے اڑا دیتی تھی اور جیسے ہی وہ آتی تو کملا اسے
فوراً دوسرے کمرے میں لیجاتی ، یا پھر نہ جانے کسی ایسی چیز کا
ذکر کرتی جسے سنتے مجھے فوراً بازار جانا پڑتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آخر یہ سب کیا ہے ۔ ۔ ۔ بارہا یہ سوال میرے ذہن کے گوشوں میں جاگ
جاگ کر سو گیا ۔ ۔ ۔ اس سے پہلے اگر کملا کی کوئی سہیلی آتی تھی ۔ ۔ تو وہ
فخر سے مجھ سے ملاتی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ میرے بھیا ہیں ۔ ۔ ۔ کالج میں پڑھتے
ہیں ۔ ۔ ۔ بڑی ہی اچھی کہانیاں لکھتے ہیں ، اور بہت ہی میٹھے میٹھے
گیت ۔ ۔ ۔ بیڈمنٹن میں ان کا ثانی نہیں ۔ ۔ ۔ کالج کے کپتان ہیں
۔ ۔ ۔ اور اب تو میں کالج چھوڑ کر یونیورسٹی میں آ گیا تھا ۔ ۔ ۔

لیکن اب تعریفیں تو درکنار ۔ ۔ ۔ ایک دفعہ شانتی کا سایہ بھی نہیں
پڑنے دیا ۔ میرے قریب ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کملی ۔ ۔ ۔ ۔ میری پاسبانِ عقل کب سے بن گئی ۔

سے پانچ سال چھوٹی ہے مجھ سے . . . .

شانتی بھی اگر دوسری لڑکیوں کی طرح مجھ سے متعارف ہوتی. تو زیادہ سے زیادہ ایک مدھم سا نقش میرے دل پر چھوڑ کر کہیں گم ہو جاتی، اور کبھی کوئی دھندلا سا نقش میرے ذہن میں ابھر آیا کرتا. . مگر اب تو وہ ایک نقش بن چکی تھی . . . ایک ایسا کانٹا جو وقت، بے وقت میرے دل میں کھٹکتا رہتا تھا . . . . ایک ایسا درد، جس سے کسی صورت مفر نہیں تھا. .

ایک بار میں شام کو بیڈمنٹن کھیل کر آیا اور نہانے سے پہلے چند منٹ آرام کرنا چاہتا تھا . . . مگر کمرے کے دروازے پر پہنچتے ہی کملا کی آواز آئی . . .

بھیا! یہاں مت آنا، پردہ ہے . . . .

پردہ؟ کون ہے .

میری ایک مسلمان سہیلی ہے . .

اور میں آکر برآمدے میں بیٹھ گیا . . خیالوں میں تیرتے تیرتے پھر شانتی کے پاس پہنچ گیا . . . اور اچانک ایک خیال بجلی کی سرعت سے میرے ذہن میں کروٹ لے کر اٹھ بیٹھا . . .

نہ جانے ماں کب سے شادی کے لیے اصرار کر رہی ہے . اگر شانتی ان کی بہو بن جائے تو . . . . تو یہ آگ جو میرے دل میں لگی ہے سرد ہو جائے گی . . یہ بے نام خلش مٹ جائے گی . . . یہ کھٹکتا ہوا کانٹا نکل جائے گا . . . اور یوں بھی اس میں کیا کمی ہے . . . اگر کملا کی کلاس میں فیل ہو گئی ہے تو انٹرمیڈیٹ میں ہو گی . . اور کس قدر پیارا رنگ ہے اور اس کے باقی ماندہ خطوط کتنے دلکش! . . فیرنی بھی منوا لے اس

موٹی ناک کے ..... جو کچھ زیادہ بھدی نہیں لگتی ... تو پھر ٹھیک ہے شانتی میری ویران زندگی میں بہار بن کر آئیگی ......

اور میں یہ سوچ کر ایک سانس بھی سکون کی نہ لے پایا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی ....

"اچھا کملا ! اب میں چلتی ہوں ....."

اور یہ آواز شانتی کی تھی .... میں نے مڑ کر دیکھا تو شانتی ہلکی گلابی ساڑھی میں ملبوس کملا سے ہاتھ ملا کر جدا ہو رہی تھی .... گلابی خدوخال والی شانتی کو بھی گلابی آنچل میں سنورے ہوئے دیکھ کر بھی میرا بڑھتا ہوا غصہ نہ رک سکا .. میری طبیعت یک لخت مضمحل ہو گئی ....

شانتی نے میری طرف دیکھا اور مسکراتی ہوئی چلی گئی ....

آخر یہ کملا کی بچی مجھے سمجھتی کیا ہے ... کبھی دل چاہتا تھا کہ اٹھ کر خوب پیٹوں کملا کو .... مگر وہ عمر میں چھوٹی تھی۔ لیکن اب بڑی ہو چکی تھی

خیر — شانتی میری ہو کر رہیگی ..... میں نے فیصلہ کیا۔ کیونکہ خلش بڑھتی جا رہی تھی، اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے میں شانتی کے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا ......

دوار کا ناتھ جی ہمارے دور کے رشتہ دار تھے۔ اور ان کی بیوی جنھیں میں موسی کہنا تھا۔ زنانے ہسپتال میں آئی ہوئی تھی، انکی حالت کافی خراب تھی ..... ہمارا سارا گھر بھی بہت پریشان تھا ... اور سب لوگ ہسپتال گئے ہوئے تھے۔ اس لیے میں اس روز کالج نہیں گیا ...

میں تنہا کمرے میں بیٹھا ہوا جوش کے کیف و نشاط میں ڈوبا ہوا تھا کہ

شانتی ایک بیقرار لہر کی طرح بل کھاتی اندر داخل ہوئی . . . میں جان بوجھ کر سر جھکائے بیٹھا رہا . . . وہ تقریباً سارے گھر میں پھر کر بولی . . .
آج گھر میں کوئی نہیں ہے . . . کہاں گئے سب لوگ ؟
بیٹھیئے . . . میں نے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے کہا . . .
شکریہ — یہ — تصویر آپ کی ہے . . . بہت خوبصورت ہے . .
شکریہ . . . تصویر تو میری ہی ہے . . . غالباً مجھ سے مختلف . . .
نہیں تو . . . .
تو پھر آپ کو شبہ کس طرح ہوا . . . .
شبہ تو نہیں . . . بس یونہیں . . . وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر مسکرادی . .
بہرکیف . . . آپ کو پسند ہو تو لے سکتی ہیں . . .
لے نہیں سکتی !
کیوں ؟ کیا اوپری دل سے تعریف کر رہی تھیں ؟
نہیں تو . . . مجھے تو بے پناہ پسند ہے . . . مگر . . .
مگر کیا . . . ؟
کملا نے منع کیا ہے
منع کیا ہے کیوں آخر . . . ؟
وہ کہتی تھی — آپ امی سے پوچھ لیجئے گا . . .
نہیں ، آپ بتائیے . . . میں نہ جانے کب سے آپ سے گفتگو کرنے کے لیے تڑپ رہا ہوں . . .
مجھ سے . . . ؟
ہاں . . . . !

میں نے خود کئی مرتبہ آپ سے ملنا چاہا... مگر کملا نے منع کر دیا

آخر کیوں؟ کیا کہتی تھی... بتاؤ نا...

وہ کہہ رہی تھی... بھیا جس لڑکی سے متعارف ہوتے ہیں پھر اُسے بھول جاتے ہیں...

تو تم چاہتی ہو کہ میں تمھیں نہ بھولوں...... بھئی شرمانے کی نہیں ہوتی... بتاؤ نا.. تم میری یادوں میں بس رہنا چاہتی ہو..

کملا چاہتی ہے

اور تم؟

پتہ نہیں...

خیر تم زبان سے نہ کہو... مگر تمہارے تمتماتے ہوئے رخسار، جھکی ہوئی نظریں، اور سمٹا ہوا جسم مجھے یقین دلا رہا ہے کہ تم میری ہو تم وہ ہستی ہو، جس کی تلاش میں میرا بھٹکا ہوا ذہن ابد سے ٹھوکریں کھا رہا تھا... میں نے تمہاری جھلک بہاروں کی سنورتی جوانی میں ستاروں کی مدھم سرگوشیوں میں... اور شفق کے مسکراتے ہوئے رنگوں میں دیکھی ہے... ہر سندری کی خوبصورت روح تم ہی تھیں، جو میرے دل کی دھڑکنوں کے ساز سے ہم آہنگ ہو کر محبت کے غیر فانی گیت گاتی رہی... تم میری ہو اور ہمیشہ میری رہوگی...

یہ میرا آخری فیصلہ ہے... دنیا کی کوئی طاقت ہم دو محبت کرنے والے دلوں کے بیچ میں نہیں آسکتی... آؤ! میرے قریب آؤ میری شانتی!... میری منتظر بانہیں تمھیں سینے سے لگانے کے لیے بے چین ہیں...

بھیا! مٹھائی کھلوائیے!

وہ کس خوشی میں ....

ایک خوش خبری ہے .... اگر سنو گے تو اچھل پڑو گے۔

تم سناؤ تو! میں اچھلنے کے لیے تیار ہوں ....

مذاق نہیں ... میں بہت سنجیدہ ہوں ....

میں بھی بہت سنجیدہ ہوں ... تم بتاؤ تو، مٹھائی ضرور ملے گی،

صرف مٹھائی سے کام نہیں چلیگا ... مجھے ایک ساڑھی بھی لاکر دینی ہوگی۔

بھئی یہ خوشی تو مہنگی ہوتی جا رہی ہے ... خیر لا دوں گا ....

مگر بتاؤ تو ....

آپ کی شادی طے کی ہے ایک جگہ ....

شادی ــــ یہ تو کوئی خوشی کی بات نہیں .... کیونکہ شادی تو ایک دن ہوگی ہی ....

وہ تو میں بھی جانتی ہوں .... مگر ایک بہت ہی پیاری لڑکی کو میں نے پسند کیا ہے ....

ہاں! یہ ہوئی نا بات! کون ہے وہ ....؟

پہلے ساڑھی ....!

وہ مل جائے گی ... مگر پہلے بتاؤ ....

آپ نے اُسے کئی مرتبہ دیکھا ہے ....

میں نے ....! میں نے تو تقریباً تمہاری ہر ایک سہیلی کو دیکھا ہے۔

وہ جس سے آپ نے کوئی بات نہیں کی ....

کوئی بات نہیں کی .... تمہارا مطلب ہے شانتی۔

ہاں! پسند ہے نا آپ کو.... کتنی پیاری ہے...
کیوں.... بس ذرا رنگ گورا ہے.... اور....
اور کیا — آنکھیں.... بال.. کیا کمی ہے اس میں.....
وہ موٹی ناک —
بس جانے دو بھیا.... ناک موٹی کہاں ہے؟ ہاں! دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں.... مگر دیکھو تو بن کتنا رہے ہیں...
خیر، تمہیں لڈو ضرور مل جائیں گے.....
تو پھر رشتہ آپ کو پسند ہے... میں ماں سے کہوں.....
کیا کہوگی ماں سے....
یہی شانتی کے متعلق...!
شانتی کے متعلق کیا...؟
بس زیادہ بھولے نہ بنیئے.... کہوں گی کہ بھیا کی شادی شانتی سے ہونی چاہیئے.... ماں کہے گی.... جا اپنے بھیا سے پوچھ.....
اور میں کہوں گی.... وہ تو اسے دل و جان سے زیادہ پسند کرتے ہیں
بس آپ جائیے! اور میرے لیے ساڑھی لے آئیے....
اچھی بات ہے.... تم جا کر ماں سے گفتگو کرو... اور جب وہ میری رائے کے متعلق پوچھیں تو کہہ دینا کہ مجھے شانتی کچھ زیادہ پسند نہیں....
کیوں بھیا! آخر اس میں کیا برائی ہے....
میں نے کب کہا اس میں کوئی برائی ہے... اگر تمہیں شادی کی بات ہی چلانی ہے تو مدھو کے لیے ماں سے بات کرو...

مادھو ؟ مگر بھیّا آپ نے تو اسے دیکھا بھی نہیں . . . . .
دیکھا کیوں نہیں . . . . اس کی تصویر دیکھی ہے . . . تم سے اس کی تعریفیں سُنی ہیں . . . .
مگر بھیّا !
اگر، مگر کچھ نہیں . . . بس تم جاؤ اور ماں سے کہدو . . . .
میں بازار چلا . . . .
سنو تو بھیّا ! شانتی بہت اچھی لڑکی ہے . . . بہت پیاری بے حد شریف . . . .
مجھے کب انکار ہے . . . . مگر میں اس سے شادی نہیں کرونگا۔
آخر کیوں ـــ ؟ بھیّا سنو تو ! اس کی ناک اتنی بڑی تو نہیں ہے . . . .

ـــ :. ـــ

منظور باجی

بھیّا! میری منظور باجی پر افسانہ لکھ دیجیے۔۔۔۔

صبح سے شام تک، تقریباً ایک ہزار الفاظ فی گھنٹہ کی رفتار سے
مستقل بکواس کرنے والی نسیم کی اکثر بے سروپا خواہشات میں سے ایک یہ بھی
منظور باجی نہ ہوئیں، ریل گاڑی ہو گئیں، جن پر جب چاہو مضمون
لکھ دو۔۔۔ مگر نسیم اور سمجھ میں تو خدا واسطے کا بیر ہے۔۔۔ مجال
جو وہ سمجھ جائے، ہزار سمجھایا۔۔۔ مگر وہ کہاں مانتی ہے۔۔۔۔ جب
اُلجھ کر کہا۔ ان پر افسانہ لکھنے کے لیے کچھ مواد چاہیے۔۔۔ ان کے
کے متعلق کچھ معلومات یا پھر کوئی رومان، کوئی حادثہ جو ان کی زندگی
وابستہ کیا جا سکتا ہو، یا پھر۔۔۔ آخر کچھ تو ہو جس پر افسانہ کی بنیاد
رکھی جائے۔۔۔۔

یہ تو میں کچھ نہیں جانتی۔ بس آپ افسانہ لکھ دیجیے۔۔۔۔

پھر وہی۔۔۔ ارے خدا کی بندی۔۔۔ وہ کون ہیں۔۔۔ کیسی ہیں

میں نے تو آج تک انھیں دیکھا بھی نہیں ... پھر افسانہ کیسے لکھ دوں

واہ بھیّا! بڑے افسانہ نگار بنتے ہیں... کرشن چندر تو بھنگی پر افسانہ لکھ سکتا ہے، اور آپ ہماری پڑھی، لکھی خوبصورت منظور باجی پر بھی نہیں...

میں کرشن چندر نہ سہی... مگر پھر بھی یہ ایک چیلنج تھا اور اسے منظور کرنے کا مطلب تھا کہ منظور باجی پر افسانہ ضرور لکھا جائے۔

اچھا تو یہ بتاؤ! تمھیں اپنی باجی کیوں پسند ہیں؟...

"بس پسند ہیں"

یہ تو کوئی جواب نہیں ہوا... آخر اُن کی کوئی خاص عادت یا چیز ہوگی جو تمھیں پسند ہوگی...

مجھے تو ان کی ہر ادا پسند ہے

توبہ ہے! میں نے تقریباً چیخ کر کہا... ارے بھئی میرا مطلب ہے کہ کوئی خاص بات جس سے تم اتنی زیادہ متاثر ہوئی ہو

"بھئی خفا ہونے کی نہیں ہوئی"... نسیم نے روٹھتے ہوئے ... "مجھے تو ان کی ہر ایک بات خاص نظر آتی ہے"

"ہوں"... میں نے نئے سرے سے کوشش کی...

"تمھاری منظور باجی کی شادی ابھی نہیں ہوئی نا..."

"کیوں نہیں... وہ تو ماشاءاللہ ایک بچے کی ماں ہیں..."

اچھا تو پھر لو میرج ہوئی ہوگی...

وہ تو ایک دن نہ جانے کس بات پر کہہ رہی تھیں کہ انھوں نے شادی سے پہلے اپنے شوہر کو دیکھا بھی نہیں تھا...

اور شادی کے بعد اچانک انھیں اپنے شوہر سے بہت زیادہ پیار ہوگیا
پتہ نہیں... بظاہر تو کوئی ایسی بات نہیں..
"اچھا.. تمہاری باجی اپنے شوہر سے آئے دن لڑتی رہتی ہیں"
"توبہ کرو بھیا!.. لڑنا تو وہ جانتی ہی نہیں...."
"تو پھر ان کے شوہر ضرور لڑتے ہونگے...."
"نہیں... وہ بھی بے حد اچھی عادت کے ہیں..."
"تو پھر انھیں شادی کے بعد ضرور کسی سے محبت ہوگئی ہوگی"
"ہٹیے!... ہم نہیں بولتے آپ سے... کیسی غلط غلط باتیں سوچتے
ہیں، آپ ہماری باجی کے متعلق...."
"ارے تو بابا... پھر تم ہی کچھ بتاؤ ان کے متعلق..."
"جو کچھ مجھے معلوم تھا بتا دیا میں نے... اور میں زیادہ جانتی بھی
کہاں ہوں.. میری ملاقات تو اسی مارچ سے ہے... جب سے
انھوں نے ہماری کلاس کو انگریزی پڑھانی شروع کی... اور میرا دل
ان کی طرف کھنچتا چلا گیا...."
"جی ہاں... اور اپنے دل کی کھینچ تان میں مجھ غریب کو تم بیکار گھسیٹ
رہی ہو....."
"ایسے ہی غریب ہیں آپ... یہ کیوں نہیں کہتے کہ افسانہ نہیں لکھا جاتا
ہمیں تو پہلے ہی پتہ تھا کہ آپ کتنے پانی میں ہیں..."
"وہ پھر تم شروع کردیں جہالت کی باتیں.. افسانہ لکھنا کیا مشکل ہے
پہلے مجھے اپنی منظور باجی سے ملا تو دو..." میں نے پیچھا چھڑانا چاہا۔
اور پھر ایک دن نسیم اپنی منظور باجی کو لے آئی......

فطری شرم اور انکساری کی گود میں لیٹی ہوئی ایک سادہ سی لڑکی جو اس
قدر پُرسکون نظر آتی تھی کہ محسوس ہوتا تھا کہ اس بحر کی موجیں اضطراب
نا آشنا ہیں۔۔۔ میں مستقل ان کے اندر کوئی Abnormal
بات ڈھونڈتا رہا تاکہ میں کسی افسانہ کی بنیاد رکھ سکوں۔۔۔ مگر اس توجہ
کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی خاموش، پُرخلوص اور سادہ طبیعت نے میرے دل
میں گھر کرلیا۔۔۔ پہلی ہی ملاقات کے بعد مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میری
زندگی میں بڑی بہن کی جو کمی تھی وہ اچانک پوری ہوگئی ہے۔

میری چھٹیاں ختم ہونے میں ابھی کچھ دن باقی تھے۔ اس لیے خالی
وقت میں کبھی کبھی منظور باجی کے یہاں چلا جاتا تھا۔۔ ایک دن
شام کو جو میں پہنچا اور حسب عادت دندناتا ہوا اندر گھسا تو ایک
لڑکی کمرے سے بھاگ کر باورچی خانہ میں گھس گئی۔۔۔

میں حیران رہ گیا۔۔۔ کسی لڑکی کا بھاگ کر باورچی خانہ میں گھسنا
تو کوئی ایسی حیرانی کی بات نہ تھی۔۔۔ مگر اتنی خوبصورت لڑکی کا اچانک
نازل ہو جانا ضرور حیران کن بات تھی۔۔۔

میں حسب عادت منظور باجی سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ اس
لیے کمرے میں جاتے ہی بغیر کسی تکلف کے پوچھا۔۔۔

"اے باجی! یہ کون قیامت تھی؟"

انھوں نے شوخ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔

"قیامت! کیسی قیامت؟ ہاں واقعی قیامت کی گرمی ہے۔۔۔"

"نہیں باجی!" میں نے رو بھٹے ہوئے کہا۔ "یہ لڑکی کون تھی جو
اس کمرے سے طلوع ہوئی اور باورچی خانہ میں غروب ہوگئی؟"

"وہ لڑکی؟ بھیا تمھیں دھوکا ہوا ہوگا۔۔۔"

"اچھا جی۔۔۔ اب آپ ہمیں گھیرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔۔۔ بھئی
تو میں چلا خود ہی باورچی خانہ میں جا کر تعارف کر لیتا ہوں۔۔؟"

"ارے بیٹھو!۔۔۔ وہ!!! وہ تو ہماری نوکرانی ہے۔۔۔۔۔
بیچاری دیہاتن ہے اس لیے شرماتی ہے۔"

"بس جانے دو باجی۔ ایسے ٹھستے دار کپڑے پہنے ہوئے ہے۔"

"یہ بات نہیں عشرت! میرے ساتھ کی کھیلی ہوئی ہے۔۔۔ میں
اُسے بالکل چھوٹی بہن کی طرح چاہتی ہوں۔ چونکہ میرے گھر آئی ہوئی ہے
اس لیے میرے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔"

بات واقعی معقول تھی۔۔۔ میں ایک دفعہ منظور باجی کو ایسا سوٹ
پہنے دیکھ چکا تھا۔۔۔ میں نے پھر کہا۔۔۔

"اچھی باجی!۔۔۔ مجھ سے پردہ نہ کرائیے۔۔۔"

"اپنے حواسوں پہ صدقے دے لڑکے۔۔۔ پرائی بیٹی ہے۔۔۔
میں کون اس کا پردہ ختم کرانے والی۔۔۔"

"میری اچھی باجی! لاڈلی باجی! پیاری باجی!"۔۔۔ جب میری خوشامدیں
اپنی تمام تر حدیں عبور کرنے لگیں تو انھوں نے وعدہ کیا کہ ایک دو روز
میں مناسب موقع دیکھ کر وہ تعارف کرا دینگی۔۔۔۔

میں جان بوجھ کر بغیر آواز دیے منظور باجی کے یہاں جاتا رہا۔
تاکہ میں اس لڑکی کو دیکھ سکوں۔۔۔ اور اکثر یہی ہوتا۔۔۔ میں چونکہ وقت
بدل بدل کر جاتا اور وہ بیچاری کچھ نہ کچھ کام کرتے ہوئے پکڑی جاتی
۔۔۔ اس کا شرمانا بدحواس ہو کر اٹھنا۔۔۔ اور اس کی عام طور سے دیہاتی

رقطع میرے دل میں گھر کرنے لگی۔

ایک دن منظور باجی نے پریشان ہو کر اسے میرے سامنے بٹھا دیا
ہتھوں میں منھ چھپائے بیٹھی رہی، اور میں اس کی مخروطی انگلیوں کی
زوں سے جھانکتے ہوئے گلابی رخساروں کے لیے تشبیہات سوچتا رہا
بڑی کوششوں کے بعد وہ بولی... اکھڑا، اکھڑا دیہاتی سا لہجہ۔
اب یہ میری کمزوری تھی یا واقعی اس دیہاتن کے لہجہ میں وہ نغمگی تھی
سنتے ہی وجد طاری ہوتا تھا... ایسا لگتا تھا جیسے کانوں میں جل ترنگ
اٹھی ہو.... چھٹیاں ختم ہوئیں اور میں باجی سے ملنے پہنچا۔ بہت سی
ں ہوئیں.... انھوں نے حسب عادت بہت سی نصیحتیں کیں،
گی گزارنے کے اصول... خطوں کی تاکید... اور نہ جانے کیا کیا
باجی کی نوکرانی بھی بیٹھی رہی... باجی کسی کام سے اٹھ کر باہر گئیں
یں نے اس سے پوچھا...
تمھیں کچھ کہنا ہے۔

"نا" اس نے انکار میں اپنی خوبصورت گردن ہلا دی۔

جب میں زیادہ پیچھے پڑا تو اس نے آنکھوں میں پیار بھر کہا..
"بھولنا متی"

دن گزرتے رہے... اور مشغول زندگی نے اپنے دامن میں
خوشگوار یاد کو لپیٹ لیا... مگر مشغول زندگی کے منتشر لمحات
مجھے صرف ایک ہی آواز آتی رہی "بھولنا متی" "بھولنا متی"...
مجیدن کی خوبصورتی کا سحر اس سے دور ہو کر قدرے کم ہو گیا تھا...
یوں بھی میں نے خلوص دل سے اسے بھول جانے کی کوشش کی...

اس کی یاد کوئی ناگوار فرض نہیں تھی بلکہ ایک کمزوری بنی جارہی تھی ایک ایسی کمزوری جس سے مفر ممکن نہیں تھا۔۔ میرے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا تھا۔۔ پڑھے لکھے برسر روزگار لڑکوں کے لیے اس بیروزگاری کے دور میں رشتوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔۔۔ اس لیے رشتے برس رہے تھے۔۔۔ مگر جب بھی کوئی نیا پیغام آتا تو وہی دیہاتن مجیدن مجھے اپنے کانوں کے پاس گنگناتی ہوئی آوازمیں فریاد کرتی نظر آتی۔۔۔

"بھولنا متی۔۔۔ بھولنا متی"

مجھ پر جیسے جادو ہو گیا تھا۔۔۔ میں کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ کر ہر جگہ انکار کرتا رہا۔۔۔ کبھی کبھی مجھے اپنی کمزوری پہ غصہ آتا۔۔۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ میں اُسے کیوں نہیں بھول سکتا۔۔۔ میں ایک پڑھا لکھا لڑکا ہوں۔۔ مجھے ایک خاص سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔۔۔ اور وہ نیٹ جاہل۔۔۔ آخر اس کی اور میری کس طرح گذر ہوگی مجھے اس کا خیال چھوڑ دینا چاہیئے۔۔۔ مگر فوراً ہی اُس کی نغمہ بار آواز میرے کانوں میں رس گھولنے لگتی۔۔۔

"بھولنا متی"

انھیں شادی کے پیغامات کی برسات میں ایک مقام ایسا بھی آگیا جس نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔۔۔ امی کا خط آیا تھا اگر تم چاہو تو تمہاری شادی منظور بھا جی کی بہن سے کر دی جائے۔۔۔ شاہینہ بی۔اے پاس ہے اور ان کی طرح بے حد خوبصورت اور اچھی عادت کی ہے۔۔۔ اور چونکہ تم منظور بھا کو کافی پسند کرتے ہو، اس لیے لڑکی کو دیکھے بغیر

تمھیں یہ رشتہ منظور کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا...

اب میں کیا کروں... کئی دفعہ امی کو خط لکھ لکھ کر پھاڑا... منظور باجی کا خلوص اور پیاری شخصیت ایک طرف اور مجیدن کا حسن اور اکھڑ اکھڑا دیہاتی لہجہ ایک طرف... ان کی بہن بھی ان کی طرح ضرور خوبصورت ہوگی... تعلیم یافتہ بھی ہے... اور میں نے رشتہ منظور کرنے کا فیصلہ کیا ہی تھا کہ مجیدن کی کبھی روتی اور کبھی مسکراتی آنکھیں میرے سامنے آگئیں... میں نے اس کا خیال جھٹک کر آگے بڑھنا چاہا... مگر اس کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی

بھولنا مت... بھولنا مت...

اور ایک دن ان الجھنوں سے پریشان ہو کر میں نے خود منظور باجی کو خط لکھا...

میری اچھی باجی!...

میں زندگی کے ایسے دوراہے پہ آگیا ہوں. جہاں میری قوتِ فیصلہ جواب دے چکی ہے... شاید آپ جانتی ہوں کہ مجھے ان دنوں اپنی شریکِ حیات کے بارے میں فیصلہ کرنا ہے... اب میرے سامنے دو لڑکیاں ہیں... ایک طرف آپ کی بہن ہیں... جو عمدہ تعلیم و تربیت کے علاوہ یقیناً آپ جیسی پیاری شخصیت کی مالک بھی ہونگی اور دوسری طرف ہے وہ بے رحم مجیدن... جو کسی وقت بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتی... کاش میں اس سے نہ ملا ہوتا... خیر...

حقیقت یہ ہے کہ اس کا خیال ہر وقت میرے اعصاب پر سوار رہتا ہے... میں انتہائی کوشش کرنے کے باوجود بھی اس کو نہیں بھول پایا

شاید کبھی نہیں بھول سکتا......"

"میں جانتا ہوں کہ میرے اس فیصلے پر گھر میں طوفان آجائے گا.. خاندان کی عزت کا رونا رویا جائے گا.... بزرگوں کی ناک دیوار چین بن کر سامنے آجائے گی... لیکن میں..... میں انتہائی افسوس اور ندامت کے ساتھ اقرار کرتا ہوں کہ میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا... اب میں کیا کروں... آپ ہی میری پاسبان عقل بن جایئے اور روشنی دکھایئے..

شاہینہ میں اتنی خوبیاں ہیں کہ ان کو ہزار اچھے لڑکے مل جائینگے۔ مگر مجیدن کو شاید مجھ سا بیوقوف کوئی اور نہیں ملیگا....

آداب و خلوص...... جواب کا منتظر

آپ کا عشرت

منظور باجی کا جواب آیا... انھوں نے میرے فیصلہ کی تعریف اور قدر کی تھی.... اور اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا تھا... اور مجھ سے کہا تھا کہ تم چھٹی لے کر جلد آجاؤ... میں یہاں تمام لوگوں کو ہموار کرنے کی پوری کوشش کرونگی... میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا.... اور منظور باجی کی وقعت میرے دل میں کچھ اور بڑھ گئی... واقعی وہ جواہرات میں تولنے کے قابل ہیں... اپنی بہن پہ ترجیح کو بھی انھوں نے محسوس نہیں کیا، اور انسان دوستی کے جذبہ کو ہر شئے سے مقدم سمجھا.....

میں کچھ پشیمان اور ایک دبی دبی سی مبہم خوشی لیے چھٹی لے کر گھر پہنچ گیا... میں سوچ رہا تھا کہ لوگوں کی ابرو پر بل ہونگے.....

اور اگر میری خوشی کی خاطر یہ بھی نہ ہوگا تو ایک بے دلی سی ضرور مسلط ہو گی... مگر میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی..... جب گھر میں گھستے ہی حسب روایت نہایت پیار بھرا استقبال ہوا...

بہن، بھائی سبھی خوشی سے ارد گرد اکٹھے ہو گئے.....

نسیم حسب دستور چیختی، چلاتی پھرتی رہی... میں سب کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کرتا رہا... کہ کہیں موہوم سی شکایت کا شائبہ ہی نظر آجائے... مگر مجھے ناامیدی ہی ہوئی...

میں خواہ مخواہ ڈر رہا تھا... میں نے سوچا اور آخر کار نسیم سے پوچھ ہی بیٹھا......

نسیم کم از کم تمہیں تو مجھ سے خفا ہونا چاہیے تھا...

مجھے کیوں؟

مجیدن سے شادی کرنے پر....

واہ! خفا کیوں ہوتی.... اتنی پیاری تو لڑکی ہے....

مگر میں نے تمہاری چہیتی منظور یا جی کی بہن سے شادی کے لیے جو انکار کر دیا ہے....

تو کیا ہوا....

معلوم ہوتا ہے ان سے لڑائی ہو گئی ہے...

لڑائی.... خدا نہ کرے.... میں تو پہلے سے زیادہ چاہتا ہوں... انھیں...

تو پھر یہ بے رخی کیسی....

وہ اس لیے کہ مجیدن اور شاہدہ کی صورتیں آپس میں ملتی ہیں اور

میں چونک گیا....

کیا وہ دونوں ایک ہی تو نہیں....

شاید!

میری اچھی بہن.... سچ بتاؤ...

ہاں....

بڑی خراب ہیں تمہاری منظور باجی.... مجھے خواہ مخواہ اتنے دن دھوکے میں رکھا.....

جب وہ بے حد اچھی تھیں تو آپ افسانہ نہیں لکھ سکے......

اب تو لکھ دیجئے....

ہاں اب میں ضرور لکھدوں گا.... لاؤ میرا پیڈ لاؤ.... پہلے افسانہ ہی لکھدوں....

—.....✕.....—

چڑی کا غلام

رمیش نے کہا

(Six No Trumps) سکس نوٹرمپس

وجے نے ایک لمحہ کے لیے اپنی عینک اوپر سرکائی... ٹانگیں تیزی سے ہلنی شروع ہو گئیں اور اس نے حسبِ عادت ڈرتے ڈرتے کہا۔

(Double) ڈبل !!

(Re - Double) — ری ڈبل

اسلم گرجا !

نو بِڈ (No Bid) میں اور کر بھی کیا سکتا تھا...

رمیش نے پان کا چھکا چلا اور اسلم نے اپنے پتے کھول دیے

میں نے تنقیدی نظر ڈمی پر ڈالی... پان، حکم اور اینٹ

تینوں سوٹ Guarded تھے .... چڑی کے دو پتے
ڈمی میں اور دو میرے پاس تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ کلب کے
پانچ پتے رمیش کے پاس ہونے چاہئیں اور چار وجے کے پاس ....
حکم کا اکّہ باہر بیٹھا ہی .... اور میں مطمئن ہو کر کھیلنے لگا ....
رمیش یہ کانٹریکٹ کبھی نہیں بنا سکتا. وجے کا ڈیل Brilliant تھا.
پان کی بیگم لے کر رمیش نے حکم Suit کھیلنا شروع کیا. تیسری
ٹرک (Trick) پر وجے نے حکم کا اکّہ لے کر پھر پان کی چال کی۔
انجام کار رمیش نے کلب یعنی پھول کا سوٹ کھیلنا شروع کیا،
اور چڑی کے پتوں کی تقسیم دو اور چار تھی ، میرے اور وجے کے
درمیان اس لیے وہ ایک ڈاؤن ہو گیا ..... دوسری ٹرک وجے
نے چڑی کے غلام کی لی ....
رمیش نے کھسیانی ہنسی کے درمیان کہا .... دیکھا تم لوگوں
نے چڑی کے غلام نے اپنی تصویر بچا کر رکھی تھی ...
ایک فرمائشی قہقہہ پڑا .... اور وجے نے خاموشی سے ہمارے
اسکور میں چار سو کا اضافہ کر دیا ....
اوپر والے کس قدر شور مچاتے ہیں .... نیچے والے مکان سے
ایک ترنم ریز آواز آئی .... اور ہم سب لوگ دم بخود رہ گئے ....
.... انجام کار ہمارا پڑوس آباد ہوا .... ایک ہی جست میں اسلم
اور رمیش کھڑکی پر پہنچے اور اس کی درازوں سے جھانکتے ہوئے
رمیش نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلایا .. "پان کی بیگم !"
پان کی بیگم !"

اور ہم تینوں کھڑکی کی درازوں سے چپک گئے . . .
وجے کی ٹانگیں اور زور و شور سے ہلنے لگیں . . .
نازک، بل کھاتی نار . . . سفید رنگ، گلابی ہونٹ . واقعی
بنائی پان کی بیگم تھی . . . رمیش کے ذہن میں ابھی تک پچھلے گیم کی
واہٹ موجود تھی . . . اس نے پھر وار کیا . . .
ابے او چرخی کے غلام ! بند کر اپنا چرخہ اور ایک نظر تو بھی
یکھ لے . . .
اور اس دن کے بعد سے وجے کے باقی تمام خطابات فراموش کر دیے
ے . وہ صرف چرخی کا غلام رہ گیا . . . اور لتا . . . وہ تو پان کی بیگم تھی ہی . .
لتا کے والد ADM کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے . . . بیچارے صبح
بجے نکلتے اور کبھی شام کو سات یا آٹھ بجے سے پہلے واپس نہ آتے .
B.A. فائنل میں تھی . . . وہ تین بجے کالج سے واپس آجاتی تھی ،
پہلے ہی سے وہاں پہنچے ہوئے ہوتے تھے . . . پھر اکثر لتا بچوں کو
ڑکتی . . . ہمارے شور یا خاموشی پر لطیف طنز اور اشارے . . .
ی اس کے باہر جانے کا ذکر ہوتا تھا تو کبھی سینما کے ٹکٹوں کا ،
ہم بوکھلا کر بھاگا کرتے . . . مگر اکثر چوٹ ہی ہوتی تھی ـ
ہ اس روز باہر ضرور جاتی مگر پروگرام ہمیشہ غلط بتاتی . . . .
شروع شروع میں وجے بھی ہمارے ساتھ جھانکا کرتا تھا ـ
جب رمیش اور اسلم نے مستقل اسے چرخی کا غلام کہہ کر چھیڑنا
وع کر دیا تو ہماری تاک جھانک کے وقت صرف اپنی آرام کرسی پر
ا ٹانگیں ہلا ہلا کر سوچتا رہتا . . . مجھے کبھی کبھی اس پر بڑا رحم آتا

وہ ہمیشہ ایک شدید احساسِ کمتری کا شکار نظر آتا.....
مگر پھر بھی نہ جانے کیوں وہ ہمارا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ
نظر نہیں ہوتا تھا.......

اسلم نے سنجیدگی سے کہا.....

"کیوں بے چرخی کے غلام! اگر دیں تیری شادی پان کی بیگم سے
وجے کی ٹانگیں زور زور سے ہلنی شروع ہو گئیں....

رمیش نے کہا.....

لو چل پڑا چرخہ!

وجے ایک تو تھا ہی کچھ یونہی.... چھوٹا سا قد.... دبلا چہرہ
ناک پر موٹے شیشوں کی عینک.... ڈھیلے ڈھیلے ہاتھ پیر،
اور اس پر اپنے والد مرحوم کا ڈھیلا سا سوٹ ہمیشہ لٹکائے رہتا
.... وہ اگرچہ پڑھنے لکھنے میں زیادہ تیز نہیں تھا.. مگر حساب
میں سب کا ماسٹر! وہ ہماری ایک ایک کوڑی کا حساب بتا دیتا
.... اور تاش میں بھی یہی ہوتا کہ وہ ایک ایک پتے کا حساب
رکھتا اور اس لیے اس سے جیتنا بہت مشکل ہو جاتا....

وہ فطرتاً خاموش طبع تھا... اس کی خوشیاں، آرزوئیں
اور تمنائیں انتہائی طور پر محدود تھیں.... اس پر بھی اگر
کبھی کسی چیز کی حاجت ہوتی تو وہ اس کا اظہار صرف میرے سامنے
کرتا... رمیش اور اسلم تو اسے چٹکیوں میں اڑاتے تھے....

رمیش چندوسی کے ایک رئیس زمیندار کا اکلوتا بیٹا تھا،
اچھی شکل و صورت، متناسب جسم.... اور اس کی ہر چیز اور

ہر ادا سے شانِ امارت ٹپکتی تھی ۔ ۔ ۔ اسلم انتہائی جامہ زیب اور وجیہہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ وہ یونیورسٹی کا کرکٹ کیپٹن تھا ۔ ۔ ۔ اس کے علاوہ بھی انتہائی سوشل اور مست انسان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میرا تعلق اگرچہ متوسط طبقہ سے تھا ۔ ۔ ۔ مگر میں یونیورسٹی کا کلچرل سیکریٹری ۔ ۔ ۔ بحیثیت شاعر جانا پہچانا اور تقریری مقابلوں میں بہت سے انعامات حاصل کیے ہوئے ۔ اس لیے اس گروپ میں بھی میں ایک خاص مقام رکھتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔

یوں تو ہم چاروں ہوسٹل میں رہتے تھے ۔ ۔ ۔ مگر رمیش نے یہ مکان شہر میں اپنے دوستوں اور منیم صاحب کے لیے رکھ چھوڑا تھا ۔ جو ہر تیسرے روز چندوسی سے اس کی خیریت دریافت کرنے آتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ فرصت کے اوقات میں ہماری محفل وہاں جما کرتی ۔ ۔ ۔ ۔ مگر جب سے ہماری پان بیگم وہاں آئی تھیں ، ہمارا اوڑھنا ، بچھونا ۔ ۔ ۔ وہی مکان ہو کر رہ گیا تھا ۔ ۔ ۔ اگرچہ ہم لوگ ہوسٹل کے مستنیر تھے ۔ ۔ ۔ مگر ہمارے تقریباً روزانہ دیر سے آنے اور کبھی کبھی غائب رہنے سے وارڈن صاحب کو بھی تشویش ہونے لگی ۔ ۔ ۔ مگر ان کی تشویش کا ایک علاج رمیش کے پاس تھا ۔ کبھی رساول ۔ کبھی آم یا کوئی دوسری موسمی چیز خاموشی سے ان کے گھر بھجوا دیتا ۔

لتا کی دوڑ میں بظاہر رمیش ، اسلم اور میں بھی شریک تھے ۔ وجے نے کبھی اس سلسلہ میں اپنی زبان نہیں کھولی ۔ ایک بار اسلم نے Initiative لیا اور لتا کی چھوٹی بہن کو چاکلیٹ کے چھ پیکٹ خرید دیے ۔ ۔ ۔ رمیش کو جوش آیا ۔ ۔ ۔ اس نے اگلے روز رومالوں کا

ایک سیٹ خرید کر بے بی کو دیدیا ... میں کہاں پیچھے رہنے والا تھا ...
ایک دن بے بی کی کاپی لے کر اپنی ایک نظم "ان کے نام" جسے پڑھ کر میں یونیورسٹی کا مشاعرہ لوٹ چکا تھا ... لکھدی ....

ہم تینوں اپنے اپنے کارنامے ایک دوسرے کو سنایا کرتے . مگر کسی قسم کی تلخی یا حسد ہم لوگوں کے درمیان کبھی پیدا نہیں ہوا ...
دجے حسب عادت خاموش، آرام کرسی پر پڑا ہوا سنتا رہتا اور اپنی ٹانگیں ہلایا کرتا ....

ایک دن میں اور اسلم جو یونیورسٹی سے لوٹ کر آئے تو رمیش کا چہرہ کھلا ہوا تھا اور وجے اپنی دھن میں مست آرام کرسی پر پڑا تھا.

کیوں بیٹا! یہ بتیسی کیسی کھلی جا رہی ہے ؟ —
رمیش نے مسکراتے ہوئے کہا ...
اگر ابھی سے بتا دیا تو بیٹا بیہوش ہو جاؤ گے ... چلو ذرا کمرے کی صفائی کرواؤ ....
وجے کی ٹانگیں اور زور و شور سے ہلنے لگیں ...
"وہ کس خوشی میں ؟ کیا کوئی دلہن آنے والی ہے —"
"بے شک ! بتاتا ہوں — وہ دیکھو چوہی کے غلام کا چرخہ تیز ہونے لگا ہے ...."

"اب بتا بھی چکو" ... میں نے موضوع بدلا ....
"لو سنو" ... رمیش نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا ...
آج ہماری سالگرہ ہے ... ایک بڑا سا کیک آ رہا ہے ....
تم لوگ، ایک ایک تحفہ ہمارے لیے لاؤ گے - اور آج کے مہمان خصوصی

ہونگے، ہم تینوں میں سے کسی کی ہونے والی بیوی۔ سالے، سالیاں اور ساس صاحبہ۔۔۔۔"

"سچ"۔۔۔ ہم دونوں کے منھ سے بے اختیار نکلا۔۔۔"

اور اسلم دوبارہ شیو کرنے بیٹھ گیا۔۔۔۔

پارٹی ہوئی۔۔۔ سب لوگ آئے تھے۔۔۔۔ پان کی بیگم بھی۔۔۔ماں کی وجہ سے کچھ شرمائی شرمائی سی تھی۔۔۔ اور پھر گھنٹوں باتیں ہوتی رہیں۔۔۔ رمیش نے اپنی زمینداری۔ شکار گاہوں۔ کوٹھیوں اور کاروں کا ذکر کیا۔۔۔ اسلم کی قمیص کے کھلے ہوئے بٹنوں میں سے اس کا کسرتی جسم جھانک رہا تھا۔۔۔ اور اس نے نہایت سنجیدگی سے کرکٹ Combined University Team کے ساتھ اپنے ولایت جانے کے امکانات پر بحث کی۔۔۔۔

میرا موضوع میری شاعری کا نیا پیغام تھا جو مردہ قوم میں ایک نئی روح پھونکنے والا تھا۔۔۔ یا اُن ڈراموں پر بحث تھی، جو میری ہدایت اور اداکاری کی وجہ سے پیشہ ور اداکاروں کو مات کر گئے تھے۔۔۔ اور وجے خاموش بیٹھا اپنا چرخہ چلاتا رہا۔۔۔

اس ملاقات نے ہم لوگوں میں نئی روح پھونک دی۔۔۔۔ زندگی میں جیسے نیا حسن رچ گیا تھا۔۔۔ مگر تیرا ہوا امتحان کا۔۔۔ چار و ناچار کتابوں کی طرف توجہ ہوئی۔۔۔ آخری پیپر تھا تو رمیش کے منیم جی آ گئے۔۔۔ اُسے سیدھا نینی تال جانا تھا۔۔۔ میں اور اسلم انسوری چلے گئے اور ہمارے کمرے کی چابی وجے کے پاس رہی کیونکہ وہ ایم۔ اے فائنل کی تیاری کرنے والا تھا۔۔۔۔

مسوری کے پُرسکون ماحول اور ہمہ رنگ دلچسپیوں میں ہم لوگ کھوئے ہوئے تھے کہ وجے کا تار ملا.....

فوراً آؤ.....

اس شدید گرمی میں لکھنؤ کا سفر قیامت سے کم نہیں تھا.... مگر میں نے سوچا بیچارہ وجے وہاں تنہا ہے، کہیں بیمار وغیرہ نہ ہو گیا ہو..... اسلم نے اُسے اور مجھے دونوں کو بے نقط سُنائیں.... مگر میں نے رختِ سفر باندھ لیا اور لکھنؤ پہنچا....

وجے اپنی آرام کرسی میں آنکھیں بند کیے اپنا چرخہ چلانے میں مصروف تھا.... مجھے دیکھ کر مسکرایا اور کہا....

بڑا اچھا کیا میرے بھائی، تم آ گئے، میں تو بہت پریشان تھا۔

میں نے اُبلے ہوئے آلو کی طرح پسینہ پونچھتے ہوئے کہا......

تم تو اچھے بھلے نظر آتے ہو..... آخر کیا مصیبت تھی جو مجھے بلا بھیجا....

بڑے بھائی! آپ کو میں نے اس لیے تکلیف دی کہ پرسوں میری شادی ہے....

شادی! میں نے تقریباً چیخ کر کہا... کیا دماغ خراب ہے؟

نہیں سچ! بڑے بھائی....

مگر کیوں.... کس سے....

لتا جی سے.....

اور مجھے ایک دم ٹھنڈے پسینے آ گئے... چند منٹ بعد میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا...

ایم ۔ اے ۔ پاس کرنے تک تو صبر کر لیا ہوتا....

اور وجے نے تیزی سے کہا.....

اب انتظار نہیں ہو سکتا تھا ۔ بدنامی ہو جائے گی....

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا.....اور مجھے ایک دم ایسا لگا جیسے ایک تاش کا پتہ پھیلتے پھیلتے پوری دیوار بن گیا ہے .... اور وہ ہے چڑی کا غلام ؛ جو دیوانہ وار قہقہے لگا رہا ہے.....

اسلم ۔ رمیش اور میں تینوں مجرموں کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑے ہیں ۔...

.....:():.....

سودا

"ہاں! اب تو وہ اُمّی سے شادی کریگا"

نغمہ کا دل ایک دم بیٹھ سا گیا.... نہ جانے کتنی کوشش کے بعد اس نے اُبلتے ہوئے آنسوؤں کو روکا.... اور ادب سے آداب کہکر ایک طرف بیٹھ گئی — اور پھر باتیں ہوتی رہیں... بہت سی باتیں — دنیا کے متعلق، گھر کے متعلق... موسم کے متعلق، اپنی منتظمانہ شان — باورچی خانہ کی خوشبوئیں.... رشتہ داریوں کے جھگڑے... مگر نغمہ خاموش بیٹھی سب کچھ سنتے ہوئے بھی کچھ نہیں سُن رہی تھی....

"بہن! بڑی خاموش ہے نغمہ بیٹی"

وہ اور سمٹ گئی — اُداسی کی ایک اور سرد لہر نے اس کے اعصاب پہ مسلط خاموشی کو اور گہرا کر دیا —

"میں تو تنگ آگئی ہوں اُس کی اس عادت سے ــــ ہر وقت جیسے سانپ سونگھے رہتا ہے ..."

"اس میں تنگ آنے کی تو کوئی بات نہیں .... خاموشی تو اچھی عادت ہے .... اور خاص طور سے اس زمانہ میں جب شرم وحیا کا نام بھی کوئی نہیں جانتا .... جسے دیکھو ہوائی دیدہ نظر آتی ہے"

نغمہ کی آنکھیں کچھ اور بھیگ گئیں ...

"یہ تو ٹھیک ہے بہن .... کل کو اسے پرائے گھر جانا ہے .... اگر یہ یوں ہی منھ میں گھنگنیاں ڈال کر وہاں بھی بیٹھی رہی تو آنے جانے والے یہی سمجھیں گے کہ لڑکی یا تو گونگی ہے .... یا توتلی ....

اپنا اپنا خیال ہے .... میرا جاوید تو شرمیلی لڑکیوں کو بہت پسند کرتا ہے .... ابھی کل کی ہی بات ہے ــــ جاؤ بیٹی تم آرام کرو۔

اور نغمہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ شکنجے سے چھوٹ گئی ہے، اور منوں بوجھ اس کے سر سے اتر گیا ہے ــــ .... مگر ایک بے نام خلش نے اُسے پھر آن دبوچا۔ آخر کب تک ....؟

آج پھر سودا ہوگا .... میں کس وقت سوتی ہوں، کس وقت اٹھتی ہوں .... میرے منھ میں کتنے دانت ہیں .... میرے چہرے کا گلابی رنگ اور رخساروں پر مسکراتا ہوا تل فطری ہے۔ یا میک اپ کا رہین منت .... ماں باپ کی حیثیت کیا ہے .... کتنے بھائی بہن ہیں .... تعلیم کتنی ہے .... ناچ سکتی ہوں .... اور نہ جانے کیا کیا!!

یہ خدا جانے میری امی کو کیا ہوگیا ہے .... دل وجان سے چاہنے والی امی اب کیوں میری صورت سے بیزار ہوگئی ہیں

کل تک میں اُن کے لیے ایک مسکراتا ہوا پھول تھی... اور اب اچانک بوجھ بن گئی ہوں.....

"بیٹی خاموشی اچھی عادت ہے...." "دوسروں کے سامنے زیادہ بیٹھنے اور بے وجہ گفتگو سے احتراز کرنا چاہیے....." اور جب میرا بچپن انکے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنا کر جوان ہو چکا ہے.... خاموشی میری فطرت بن چکی ہے.... تو وہ چڑھ جاتی ہیں کہ میں اتنی خاموش کیوں ہوں۔

.....میں خاموش کہاں ہوں، لوگ میرے سینے میں اُبلتا ہوا لاوا کیوں نہیں دیکھتے.... نہ جانے کتنی اَن کہی داستانیں میری آنکھوں میں تڑپ رہی ہیں..... نہ جانے کتنے گیت میری زندگی کے خاموش سے ساز کی مدھم سی لے پر تڑپتے رہتے ہیں... آخر کوئی میری خاموشی کی زبان کیوں نہیں سمجھتا.....؟

"آج مجھے میری خاموشیوں کا ہمراز مل گیا....." یہ ایک سرگوشی تھی جو اس کے دل نے سُہیل کو ایک نظر دیکھتے ہی کی..... وہ بہت زیادہ حسین نہیں تھا.... مگر اس کے معصوم چہرے پر ذہانت۔ متانت اور بُردباری کے کچھ ایسے نقوش تھے جو اس نے ایک نظر میں پڑھ لیے.... وہ خود کچھ کھویا کھویا سا تھا... اس کے دل کی خاموش راہوں سے پھر ایک سرگوشی اُبھری۔

"یہی ہے میرے خوابوں کا رفیق.... جس کا ہاتھ تھام کر میں نے ان غزمری فضاؤں کے بے شمار چکر لگائے ہیں جن کی کہانی میری خاموشی، جوانی کی گود میں بیٹھ کر اکثر سنایا کرتی ہے۔"

"امی! ہم تو اپنی نغمہ باجی کی شادی سُہیل بھائی سے کریں گے۔"

چھوٹی بہن نے شرارت اور معصومیت سے کہا... اور اس کی خاموشی پر

حیا کا ایک اور پردہ پڑ گیا۔۔۔ اور پھر اس کے بعد اسی طرح کے بے شمار جملے اور اشارے اس کی خلوتوں کو رنگین کرتے رہے۔۔۔

سہیل سے وہ کئی بار ملی، مگر کبھی کسی قسم کی گفتگو سے اُسکے لبوں کا کنوارا پن نہیں ٹوٹا۔۔۔۔۔۔ اس کے دل میں کئی بار نغمگی کی لہریں ابھریں۔۔۔۔ مگر نہ جانے کیوں ایک انجانا خوف اس کی زبان پکڑ لیتا تھا کہ اُس کے لبوں کی پہلی جنبش سے اُن کے رشتہ کا تقدس ختم ہو جائے گا۔۔۔ اور گفتگو کی ضرورت بھی کیا ہے۔۔۔۔ سہیل پہلی نظر میں ہی ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح اس کے سامنے آ گیا تھا۔۔۔۔ اگرچہ وہ بھی اس کے سامنے عام طور سے خاموش رہا تھا۔

"وہ بہت ذہین ہے۔۔۔۔ اس نے ضرور میری خاموش حکایتوں کو پڑھ لیا ہوگا۔۔۔۔ اُس نے میری حیا کے پردوں کے پار ان سنہری خوابوں کو دیکھ لیا ہوگا، جن کے خدوخال میری ویران زندگی سنوارا کرتی ہے۔"

"مگر سُنا ہے سہیل شادی کر رہا ہے!"

امّی کے الفاظ اس کے کانوں میں پھر گونجے۔۔۔ اُس کے آنسو اب نہ جانے کہاں سو گئے تھے۔۔۔۔ بس ایک دبی دبی سی دُکھن اسکی کنپٹیوں میں جاگ رہی تھی۔۔۔۔ وہ کیوں روئے۔۔۔۔ آخر اُس کا سہیل سے کیا رشتہ تھا۔۔۔ وہ ہمیشہ اس کے سامنے خاموش رہی۔۔۔۔ وہ سمجھتا ہوگا کہ یہ موم کی بے حس لڑکی زندگی کی کڑی دھوپ میں اسکی ہمسفر کس طرح بن سکیگی۔۔۔۔۔

اور شاہینہ۔۔۔ اُس کی ہم پیشہ ہے۔۔۔ جفاکش ہے، اور اس میں خود کو پیش کرنے اور دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہے،

وہ خوابوں کی سرزمین سے دور اس زمین، سخت زمین کے سینہ پر جی رہی ہے۔ اسے اس کا انتظار نہیں کہ کوئی خوابوں کا شہزادہ آئے اور بغیر کچھ کہے اُسے اپنے سنہری اُڑن کھٹولہ میں بٹھا کر لے جائے۔۔۔ آخر اسو کا شاہینہ سے کیا مقابلہ۔۔۔ اُسے شاہینہ کی طرف جھک جانا چاہیے تھا۔

نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔۔۔ یہاں کتنے آئے۔۔۔ تقریباً سب ہی اس کی نظر سے گزرے۔۔۔ چونکہ میرے وجود کا بوجھ امی کو کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگا ہے۔۔۔ اس لیے وہ کسی نہ کسی بہانے سے سب سے ملاتی رہیں۔۔۔ ان میں اچھے بھی تھے اور بُرے بھی۔۔۔ رشتہ دار بھی تھے اور پرائے بھی۔۔۔ مگر سب ایک جیسے تھے۔ مگر وہ سب سے مختلف تھا۔۔۔ اگر باقی سب لوگ اس کی خاموشی کے نہاں خانہ کی چوکھٹ تک نہیں پہنچ پائے تو اُسے کبھی شکایت نہیں ہوئی۔۔۔ مگر وہ بھی۔۔۔ کیا وہ بھی اوروں کی طرح تھا۔۔۔ نہیں اسے مختلف ہونا چاہیے تھا۔۔۔۔

"میرا جاوید تو شرمیلی لڑکیوں کو پسند کرتا ہے" اُسے دیکھ کر تقریباً ہر جاوید کی ماں نے یہی کہا۔۔۔ اور پھر کسی بہانے جاوید بھی آتے رہے۔ اُنھوں نے بیٹھ کر جو خودستائی کی داستان چھیڑی ہے۔۔۔ تو وہ نہ جانے کتنی بار سو سو گئی۔ سنتے سنتے اشعار پڑھ کر وہ اس سے داد طلب کرتے رہے، وہ بے دلی سے برداشت کرتی رہی۔۔۔۔۔۔ انھوں نے اپنی ذہانت، امارت، اور میک اپ کا بھونڈا مظاہرہ کیا اُس کے کان پر جوں نہ رینگی۔۔۔ اُسے نہ جانے کیوں۔ ایسی باتوں سے چڑ سی تھی۔۔۔ اور پھر ایک کے بعد ایک اُسے "ڈل"، "بودہ"

بیوقوف"۔ "خود پسند"، "مغرور" اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر چلے گئے... مگر اس نے دامن پر بیٹھ کر اُڑ جانے والی مکھی کی طرح کبھی ان کا خیال نہ کیا.....

مگر سہیل؟..... اُسے ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا... کاش وہ سب سے مختلف ہوتا... سہیل نے اس سے کبھی کوئی وعدہ نہیں کیا... مگر پھر بھی اُسے ایک انجانی سی شکایت تھی.... ایک بے نام سی شکایت.... جبکہ اوروں نے اس کے حضور میں فرش سے عرش تک ہر شے لانے اور جنم جنم تک ساتھ نباہنے کا وعدہ کیا تھا... مگر ان کے منھ پھیر کر چلے جانے سے اُسے ایک انجانی خوشی سی ہوئی...

"آخر یہ کیسا رشتہ ہے!!..."

"تو پھر میں رشتہ کی بات پکی سمجھوں..."

شاید امی اور ان کی نئی مہمان اندر آرہی تھیں... وہ اُٹھ کر برابر کے کمرے میں چلی گئی....

"بہن جلدی کیا ہے.... میں سوچ کر جواب دونگی" اور وہ تکیہ میں منھ چھپا کر سوچنے لگی....

آج پھر اُس کا سودا ہو رہا ہے.... اب وہ گھر جا کر اس پر تبصرہ کریں گی.... اُس کے لباس.... اس کی خاموشی.... اور اس کی ہر بات کا ذکر ہوگا.... گھر والے فقرے کسیں گے... جہاں یہ کسی لڑکے کی زندگی اور خوشی کا معاملہ ہے وہاں اسکی زندگی بھی داؤں پر لگی ہے، آخر وہ کیوں خاموش رہے... کیوں؟ کس لیے؟ انھیں کیا حق ہے؟ یہ لوگ کیوں نہیں سمجھتے

کہ وہ بے دام بک چکی ہے .... اس کی خاموش دنیا کا شہزادہ کب سے اپنا آرڈر بن کھولے لیے منتظر ہے ..... اور اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر دنیا سے کہہ دے .....

"مجھے یہ سودا منظور نہیں ہے .... مجھے یہ سودا منظور نہیں ہے"

مگر اس کی آواز رندھے ہوئے گلے کی گہرائیوں میں ڈوب کر رہ گئی ۔

......(۰:۰)......

اِس طوفان سے پہلے

"بھگوان نے بڑی کھیر کی، میرا تو کلیجہ کانپ رہا تھا۔ جانے کس کی موت دروازے پر کھڑی ہے" گھنشیام کی چاچی نے کہا...

"ہے! میں خود کلیجہ پکڑے بیٹھی تھی.... سن سوہن سے تمہارا کشور باہر گیا ہوا ہے.... دھڑکا لگا تھا جانے کوئی کیا آکر کہہ دے — ایک طرف تو آندھی اور مینھ کا شور دوسری طرف کشور کی پریشانی، پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی..." کشور کی ماں بولی...

"ابھی تو رات ڈیوٹی تھی... اور دیور جی کو کل سے بخار چڑھا ہے.... جب بارش تیز ہوئی تو برآمدہ ٹپکنا شروع ہوا.... ویسے ہی دل میں نہ جانے کیسے کیسے خیال آرہے تھے... جیسے ہی سیل گرا میرے تو ہاتھ پیر پھول گئے... لپک کے اندر گئی... دیور جی کو چھو کر دیکھا اور جیسے ہی انھوں نے نیند سے چونک کر میرے ہاتھ

پکڑے، ہائے رام! میں تو شرم سے گڑ گئی . . . نہ جانے کیا سوچتے ہوں گے
اپنے دل میں ——— "

"چل بے شرم! تیرے تو دیدوں کا پانی بھی ڈھل گیا" . . . پیارے
کی بیوی نے کہنی مارتے ہوئے وِتلا سے کہا . . .

"اس میں بے شرمی کی کیا بات ہے۔ سنکٹ کے سمے اپنوں کا دھیان
آتا ہی ہے . . . . یہ نہ سمجھو کہ بات ٹل گئی، یہ تو کسی کی آئی ہے جو لیکر
ہی جائے گی . . . . بس بھگوان . . . .

"شکھیا مر گئی . . . . شکھیا مر گئی" بابو کی بیوی چیختی ہوئی باہر آئی . .
گھنشیام کی چاچی کے بوڑھے چہرہ پر ایک فتحمندانہ مسکراہٹ بکھر گئی
اور وہ سبھوں کے ساتھ اُٹھتے ہوئے بولی . . . .

"یہ بال دھوپ میں چٹے نہیں کیے ہیں میں نے . . . . دس برس
کی بیاہی آئی تھی یہاں اور پچھلے پچاس سال سے دیکھ رہی ہوں . .
میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ تو کسی کی آئی ہے جو لے کر ہی جائے گی . . . . "

میرے کوارٹر کے سامنے سیمل کا بلند و بالا درخت سرنگوں تھا۔
اس ہسپتال میں کچھ عجیب سی روایت مشہور تھی کہ جب ہسپتال کے
اندر کوئی پیڑ گرتا تو کوئی نہ کوئی مر جاتا . . . . یوں تو یہ ہسپتال ہے
اور آئے دن لوگ مرتے رہتے ہیں بالکل بھیڑ بکریوں کی طرح . . .
مگر پیڑ گرنے کا مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ اب ہسپتال کے اسٹاف میں سے
کسی کی باری ہے . . . . میرا تبادلہ پچھلے سال موانہ سے یہاں یعنی میرٹھ
کو ہوا تھا . . . . ایک روز رات کو خوفناک آندھی آئی اور دھوبن کے
گھر کے سامنے والا نیم کا پیڑ زمین پر آ رہا . . . . ساتھ ہی ساتھ چیخ پکار

ایک زبردست طوفان اُمڈ پڑا ۔۔۔ تاؤ رگھبیر دیال جی سو گیا تھے ۔۔۔ اور میں یہ سُن کر حیران رہ گیا ۔۔۔ رات کے دس بجے تک تو وہ میرے ساتھ تاش کھیل رہے تھے ۔۔۔ آندھی کے آثار دیکھ کر لوگ اُٹھ گئے، اور بارہ بجے کے قریب، تقریباً پیڑ گرنے کے ساتھ ساتھ اُن کا ہارٹ فیل ہو گیا......

"سکھیا مر گئی" ۔۔۔ میں نے بھی سُنا ۔ سُکھیا گردھاری مالی کی دوسری بیوی تھی جو ابھی زندگی کے آخری دن تپِ دق کے وارڈ میں کاٹ رہا تھا۔

۔۔۔ جب گردھاری مالی کی پہلی بیوی مری تو اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی اور جب سکھیا کے پھیرے ہوئے تو وہ مشکل سے ۱۶ سال کی تھی، سکھیا کے ماں باپ نے سوچا ۔۔۔ ہسپتال کا مالی ہے ۔۔۔ تنخواہ کے علاوہ اوپر کی آمدنی بھی کافی ہے۔ سارے بغیچہ کا اکیلا مالک ہے اس کے پھولوں سے کئی روپے روز کی آمدنی ہو جاتی ہے ۔۔۔ گھر میں بھگوان کا دیا سب کچھ ہے ۔۔۔ پہلی بیوی سے صرف ایک للوا ہے سو اگر وہ اُسے اپنا سمجھے گی تو دس گیارہ سال کا پلا پلایا بچہ مل جائیگا۔ ... اور لوگوں نے بھی کہا.... مرد کی عمر کس نے دیکھی ہے۔ وہ تو ساٹھا پاٹھا کہلاتا ہے.... ذرا گردھاری کے گال تو دیکھو.... کیسے لال ہو رہے ہیں، جوانی پھوٹی پڑ رہی ہے۔... یہ نئی عمر کے لونڈے کیا قدر کریں گے.... دو چار دن چونچلے بگھارے، پھر لگے پیر پھیلانے ۔۔۔ پڑ گئے تاک جھانک میں ۔۔۔ اور پھر بھی سکھیا کو اچھا لڑکا کہاں سے ملتا.... ہاتھ نہ گلے.... ناک میں پیاز کے ڈلے ۔۔۔ کون قبولتا اُسے بنا جہیز کے اور

ادھر گردھاری اوپر سے پورے پچاس روپے دے رہا تھا... کہتا تھا، پھولوں کی رانی بنا کر رکھوں گا ۔ اور واقعی سکھیا رانی تھی ۔ بوٹا سا قد، نازک نازک سنولایا ہوا جسم ـــــ جیسے کوئی سہانی شام اُس کی رگوں میں گھل گئی تھی ـــ

سُکھیا کے ماں باپ نے اکیاون روپے لیکر سکھیا کا ہاتھ گردھاری کے ہاتھ میں دے دیا ـــ اور سوچ لیا سُکھ سے رہیگی سُکھیا ہماری ـــ سُکھیا کے بیاہ کے کچھ دن بعد ہی گردھاری بیمار پڑا ـــ اُسے دق ہو گئی تھی ـــ

للوا نے بڑے ڈاکٹر صاحب کے گھر پھول لیجانے شروع کر دیے۔ مگر ایک دن بارش میں بھیگ کر اُس کو بھی ایسا بخار چڑھا کہ جسم پر ہاتھ رکھنا مشکل تھا ـــ سُکھیا کی زندگی میں طوفان آگیا ـــ وہ ساری رات اُس کے پاس بیٹھی روتی رہی ـــ وہ اُس کا اپنا سگا نہ تھا ـــ مگر وہ اُسے اپنے گھر والے کی طرح رکھتی تھی ـــ

آج ڈاکٹر صاحب کے گھر پھول کیوں نہ گئے ـــ ڈرائیور نے چیخ کر کہا ـــــ

اور گڑیا سی سُکھیا کا کلیجہ سہم گیا ـــ

اُس نے کپکپاتے ہوئے کہا ـــ

"للوا بیمار ـــــ"

"تو مر گئی ہے کیا"... ڈرائیور نے بائیں آنکھ دبا کر کہا۔

اور سُکھیا ساڑی کے پلو میں جسم کو چراتی ہوئی للوا پر جھک گئی ـ

"شام تک ڈاکٹر صاحب کے یہاں پھول پہنچ جائیں ـــ تیر

تجھ سے اتنا بھی نہیں ہوتا......"

شکھیا پھول دے کر روتی ہوئی لوٹی.... اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے ــــ اور گیندے کے پیلے پیلے پھول جو وہ اپنے گھنے بالوں میں سجایا کرتی تھی نہ جانے کہاں بکھر گئے تھے....

"ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہیں تجھ سے.... اب تجھے ہی روز پھول لے کر جانا ہوگا اُن کے یہاں" ــــ اور پھر اپنی آواز دباتے ہوئے خوشامد سے کہا....

"کبھی دو چار باسی پھول ہمیں بھی مِل جائیں تو مہربانی"۔

ڈرائیور نے مشورہ دیا ــــ مگر شکھیا للوا کے سرہانے بیٹھی روتی رہی" اری کون مرگیا.... کیسے رو رہی ہے...."

ڈرائیور نے پلک جھپکا کر مونچھوں میں ہنستے ہوئے کہا....

"شکھیا مر گئی ، ــــ شکھیا مر گئی....

وہ روتی ہوئی للوا سے لپٹ گئی....

اجی سُنتے ہو ! شکھیا مر گئی....

کیسا بھیانک طوفان تھا ــ اِدھر سیمل گرا ، اُدھر اُسے خون کی قے ہوئی ــــ اور دیکھتے ہی دیکھتے ختم.....

وہ اس طوفان سے پہلے ہی مر گئی تھی.... میں نے اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے کہا....

"ہیں !! کیا کہا جی !....."

میری بیوی چونک کر بولی

میں . . . . میں . . . . ہاں . . . . ہیں . . . ہاں کچھ نہیں
. . . . کچھ نہیں . . . . کچھ نہیں . . . تمھیں شکھیا کے گھر جانا ہے
. . . . ضرور جاؤ . . . . میں گھر ہوں . . . . لاؤ ادھر آؤ . . . .
گھر چلو . . . . .
میں نے تھوک نگل کر کہا . . . .

— * —

پاگل

"کیا بھئی گن چکے"

وہ اُسی طرح خاموش بیٹھا آسمان کی طرف تکتا رہا

"میں نے کہا حضور! سرد آئیں بھریئے، گنگنائیے... صرف اس طرح آسمان کو تکنے سے کام نہیں چلیگا۔"

وہ پہلے کی طرح خاموش تھا

"جناب عشرت صاحب! کچھ منھ سے بولیے، سر سے کھیلیے۔ ایسا بھی کیا چپ کا روزہ"

ایک پھیکی سی مسکراہٹ عشرت کے لبوں پر اُبھری اور اس نے کنکھیوں سے جاوید کی طرف دیکھا...

شکر ہے کہ تو ٹوٹ رہا ہے.... کیا قبلہ و کعبہ کو موقع کا شعر یاد نہیں آرہا ہے.... اگر اجازت ہو تو میں عرض کردوں... ہاہا.. کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے ؎ تارے کا گو شمار میں آنا محال ہے

لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے

کچھ تو بولیے حضور.... یہ کیا "دیوداسیت" طاری کی ہوئی ہے۔
صرف تین سیکنڈ کی مہلت دیتا ہوں... اگر اب بھی آپ نغمہ سرا
نہ ہوئے تو بندہ نو دو گیارہ ہو جائے گا.....
"بیٹھو یار! اتنے خوبصورت موسم میں یہ بد مذاقی"...
عشرت نے جاوید کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا...
"خاک بیٹھو! ہم بیٹھے ہوئے ہیں اور آپ آسمان کی طرف
تکے جا رہے ہیں۔ ارے بھائی اٹامک ایج (Atomic Age) ہے
اگر عشق بھی کرنا ہے تو سلیقہ سے کرو..... اس دور میں اس قسم کی
فضول حرکتوں کا کوئی مقام نہیں ہے۔"
"کیسی فضول حرکتیں"
"یہی کہ ستاروں کو گنا جا رہا ہے... آہیں سیدھی برفخانہ
سے آرہی ہیں... چاہے سُر تال کا پتہ نہ ہو.... مگر اشعار ضرور
گنگنائے جائیں گے۔"
"میں نے اب تک ان میں سے کون سی حرکت کی؟"
"اجی آپ تو ان آوٹ اوف ڈیٹ (Out of date)
مجنوؤں سے بھی دو جوتے آگے ہیں.... اونٹ کی طرح منھ آسمان
کی طرف اٹھا لیا اور چپ سادھ لی..."
"میں اپنی قسمت دیکھ رہا تھا"
"مت ہو ارے باپ رے! تمہاری قسمت آسمان پر لکھی ہوئی ہے۔
سنا ہے کہ کاتبِ تقدیر آسمان پر ہی رہتا ہے۔
"اب بتاؤ بھی کیا چکر ہے؟"

"ستاروں کا ... یا کسی ستارہ کا؟ غالباً اس کا نام ستارہ ہے"
نہیں ... "
"اختر"
"نہ"
"انجم"
"اوہوں"
"ثریا"
"نہیں، نہیں"
"تو پھر کیا ہے؟ زحل، مشتری، کوکب، عطارد، شہابِ ثاقب، چاند، سورج، یا دُمدار ستارہ ..."
"جاوید! تم کافی ذہین ہو ... اور اس حقیقت کا اعتراف تم جس طرح اور جتنی دفعہ چاہو، کر سکتا ہوں ... مگر مجھے اتنا عقل کا دشمن بھی نہ سمجھو کہ تم خاموشی سے موضوع بدل دو گے، اور مجھے احساس بھی نہ ہو گا ..."
"حضور! آپ کی قوتِ فکر و احساس کا کیا کہنا ہے ... خادم سے قصور ہوا ... معافی چاہتا ہوں ... فرمائیے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں ...."
"میرے سوالوں کا جواب دو ...."
"ارشاد ہو ..."
"اس کا نام کیا ہے .... ؟"

"نام کچھ بھی ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے ....."
"ہوں !! اچھا کیا اس کے نام کا اس فلکِ ناہنجار سے بھی کچھ رشتہ ہے ..
"اس فلکِ ناہنجار کی مہربانیاں تو مجھ تک محدود ہیں ... ہاں اُس کا تعلق ستاروں سے ہے ..."
"ستاروں سے ... ہاں اب آئے نہ مطلب پر ! کیا تعلق ہے ؟"
"یہی کہ وہ بھی ان ستاروں کی طرح میری پہنچ سے بہت دور ہے ....
تو پھر قریب ہونے کے لیے آپ ابابیل و طیارے کی مدد سے اُڑنے والے ہیں ...
یا پھر اپنے کچے دھاگوں کے سہارے ستاروں کو زمین پر لائیں گے ..."
"نہ میں اُڑ سکتا ہوں اور نہ ستارے ہی نیچے آسکتے ہیں ۔ یہ فاصلہ تو ابدی ہے ....."
"کچھ ستارے ٹوٹ بھی جایا کرتے ہیں ...."
"پھر وہ ستارے نہیں رہتے ....."
"ہاں وہ تمہارا سر بن جاتے ہیں .... دیکھو عشرت مجھے شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہیں ... جلدی سے سیدھی سادی نثر میں بتاؤ یہ کیا نخرا ہے ....."
"یہ کس محلہ کی زبان میں گفتگو کر رہے ہو ..."
"تقریر کی آزادی میرا پیدائشی حق ہے ...."
"بہت بہتر !"
"ہاں ! میں نے اُڑتی ہوئی خبر سُنی ہے کہ تم خودکشی کے امکانات پر غور کر رہے ہو ....."
"خودکشی"

"ہاں صبیحہ کہہ رہی تھی کہ تم نے شعر کہنے شروع کر دیے ہیں،
اور اس سے پہلے کہ تم اپنے اشعار سُنا سُنا کر مجھے مار ڈالو،
میں تمھیں مار ڈالوں گا...."

"تو پھر یہ تو قتل ہوا......"

"قتل نہیں، خودکشی.... میں تو تمہارا ہمزاد ہوں!"

"نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی"

"اگر تم نے پچ مچ پورا شعر پڑھنے کی کوشش کی تو میں تمہارا
گلا گھونٹ دوں گا...."

"مگر یہ مصرع میر انیس کا نہیں بلکہ انشاء اللہ خاں انشاءؔ کا ہے"

"انشاء اللہ تب بھی میرا ارادہ نہیں بدلیگا...."

"چلو اچھا ہوگا.... ایک اہم مسئلہ تو حل ہو جائیگا..."

"پھر وہی مسئلہ! خدا کے لیے اب ان معموں میں گفتگو نہ کرو...
میں شدت سے بور ہو چکا ہوں۔"

"تو پھر کیا کروں"

"میرے چند سوال اور باقی ہیں، ان کا جواب دو"

"سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے"

"تمہارا نام"

"عشرت"

"تعلیم"

"ایم۔ اے"

"پیشہ"

"لیکچرار"

"شوق"

"شاعری"

"دیگر مشاغل"

"کتابیں پڑھنا۔ کرکٹ کھیلنا، اور جب کوئی کام نہ ہو تو آسمان کی طرف تکنا ....."

"دل کی کیا حالت ہے"

"دھڑکنے کا شغل جاری ہے"

"ان دھڑکنوں میں کوئی خاص آواز سنائی دیتی ہے..."

"ہاں... کسی کے قدموں کی چاپ... جو کبھی رگِ جاں سے قریب محسوس ہوتی ہے، تو کبھی بہت ہی دور.... ستاروں کے پاس"

"پھر دہی ستارے.... معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے ستارے ہی گردش میں ہیں"....

"بھوک کا کیا حال ہے"

"ایک وقت کھاتا ہوں"

"یہ حالت کب سے ہے"

"پچھلے بیس روز سے"

"بیس روز سے؟"

"ہاں کیونکہ آج ماہِ رمضان کی ۲۱ ویں تاریخ ہے۔ اور روزے کُل بیس ہوئے ہیں...."

"جاوید کے لبوں سے بے اختیار قہقہہ اُمڈا... مگر سوالات جاری ہے

یار عشرت! سچ بتاؤ کہ یہ سب مذاق ہے یا واقعی کچھ گڑبڑ ہے؟"
گڑبڑ تو کچھ نہیں..... ہر چیز نارمل ہے....."
"کیا کوئی نیا معاملہ ہے....."
"نہیں تو کوئی پانچ چھ سال پرانا...."
"اچھا، مگر تم نے مجھ سے کبھی ذکر ہی نہیں کیا"
"ذکر کس طرح کرتا..... مجھے خود بھی احساس نہیں تھا کہ میں غیر شعوری طور پر نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوں..... دراصل داستان شروع ہونے سے بہت پہلے ہی شروع ہو چکی تھی....."
"تم نے کہیں پہنچنے کا ذکر کیا تھا..... ہاں تو تم کہاں پہنچ چکے ہو"
"جہاں سے اب لوٹ کر واپس نہیں آ سکتا...."
"پھر تم کیا کرو گے....."
"چھٹیاں گزار کر واپس نوکری پر چلا جاؤں گا....."
"وہ..... وہ کچھ دن تو غالباً اپنے ماں باپ کے پاس رہے گی اور پھر اس کے بعد غالباً اس کی شادی ہو جائے گی....."
ہوں..... کیا وہ بھی تم سے پیار کرتی ہے....."
معلوم نہیں.....
اف خوہ! عشرت!! پھر اس سراب کے پیچھے دوڑنے سے فائدہ..
یہ دل کا معاملہ ہے.. تجارت نہیں جو میں فائدہ یا نقصان کی بات سوچوں.....
تو پھر تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے.....
شادی! شادی اوّل تو میرے نزدیک محبت کی معراج نہیں..

اور دوسرے یہ کوئی یک طرفہ چیز بھی تو نہیں ......

بس اب خدا کے لیے مجھے فلسفہ کی گہرائیوں میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کرو ... میں اس دنیا کا آدمی ہوں ... ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمھیں اس شادی میں کیا اعتراض ہے .....

اعتراض ..... مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ....

تو پھر دیر کس بات کی ہے ..... چٹ منگنی، پٹ بیاہ ...

تمہاری یادداشت بہت کمزور ہے ... حالانکہ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ شادی کوئی یک طرفہ چیز نہیں ....

آئی سی (I see) یعنی تمھیں دوسری پارٹی کی طرف سے انکار کا اندیشہ ہے .....

بہت ممکن ہے .....

اس کو ... یا اس کے متعلقین کو ...... کسی کو بھی ہو .... انکار بہر حال انکار ہوتا ہے .....

کیا تم نے اس سلسلہ میں کوئی کوشش کی ...

نہیں ....

ارادہ ہے ....

نہیں ....

کیوں ....

میں انکار برداشت نہیں کر سکتا .....

تو پھر اس خیال کو دل سے نکال پھینکو ....

اس کی جڑیں بہت گہری ہو چکی ہیں ... اب اس خیال کو جڑ سے

ھاڑ پھینکنے کی کوشش میں کلیجہ نکل آئے گا.....
عجب مشکل ہے.... مگر میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی....
کیا....
یہی کہ تم میں کیا خرابی ہے....
اگر انسان اپنے اعمال کا صحیح طور پر محاسبہ کر پاتا تو پھر فرشتوں کو
مت دینے کی ضرورت کیوں پیش آتی... یوں اگر تم میری رائے خود
رے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو میرے دوست میں تو خود کو برائی،
ناہ اور خواہشات کی دلدل میں گلے تک دبا ہوا پاتا ہوں....
"خیر.... آپ اس کسر نفسی کو تو جانے دیں.... اگر حضور کبھی
لط فہمی کا شکار نہ ہونے کا وعدہ کریں تو عرض کروں کہ جناب
س قدر خوبیوں کے مالک ہیں کہ ان کا شمار میں آنا محال ہے...
یا آسمان کے تارے ہیں....
یہ عشرت کے عزیز ترین دوست کی رائے ہے، دنیا کی نہیں،
ر دنیا نے تمہیں اس قدر قریب سے کب دیکھا ہے... جتنا کہ میں نے..
یہ سب فضول باتیں ہیں.... اچھے آدمی..... بُرے آدمی...
ے آدمی.... کالے، گورے، پُرخلوص.... آدمی صرف
و قسم کے ہوتے ہیں... غریب یا دولت مند....
اور ہم لوگ... یعنی متوسط طبقہ....
ہم لوگ یا آدمی بہت کم.... یا آدمی بہت زیادہ..
میں کچھ سمجھا نہیں....

ہم لوگ زندگی بھر پنجوں کے بل کھڑے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے
رہتے ہیں اور ہر لمحہ یہ خوف دامن گیر کہ کہیں پھر ہم ان پستیوں
میں نہ آ پڑیں، جہاں سے ابھرنے کی کوشش میں ہماری ہڈیاں سلگ
کر راکھ ہو چکی ہیں ....

یہ ایک تلخ حقیقت ہے عشرت! خیر اس بحث کو جانے دو
ہاں یہ بتاؤ کیا اس کی منگنی ہو چکی ہے ....

ابھی تک نہیں ....

ویسے شادی کی بات چیت چل رہی ہے کہیں ....

اچھی لڑکی ہے .... رشتے آتے ہی ہونگے ....

کیا وہ بہت خوبصورت ہے ....

میری نظر میں ....

اس کی خاص خاص خوبیاں گنواؤ ....

اس میں کوئی عیب نہیں ہے ....

خاموش، بے ادب! بے عیب صرف خدا کی ذات ہے ..

میرا مطلب ہے کہ میری نظر میں کوئی نہیں ہے ..

حضور میں دنیا کی نظر سے پوچھ رہا ہوں ...

تم جانتے ہو کہ میں دنیا دار نہیں ہوں ....

افسوس تم نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ..

میں تو حکم کی تعمیل کر رہا ہوں — ورنہ میں بہت مشکور ہونگا ..
اگر جناب بھی خاموش بیٹھ کر مدھم ہواؤں کی سرگوشیاں سنیں ..
جناب کو خاموشی سے اس قدر پیار کب سے ہو گیا ...

وہ بھی فطرتاً خاموش طبع ہے....

"اللہ رے محبت! کیا اُس کے مرید ہو گئے ہو!"

ہاں! کچھ ایسا ہی ہے....

جاؤ یار! تم نے تو پڑھ لکھ کر ڈبو دیا.... تم ذرا سی آمادگی ظاہر کرو تو تمھیں اُس سے بہتر لڑکی تلاش کر کے لادوں.....

میں نے عرض کیا نا، کہ میں سودا خریدنے نہیں نکلا ہوں۔ جو بہتر مال کی تلاش کروں....

تمہارے دماغ میں گوبر بھرا ہے.... میں دعویٰ کرتا ہوں کہ تمھیں اس سے بہتر لڑکی مل سکتی ہے....

مگر وہ نہیں....

"پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم"... آپ اس قدر دیوانے ہیں۔ اور اسے بھول کر بھی تمہارا خیال نہ آتا ہوگا....

تو اس سے کیا ہوتا ہے.... محبت ایک کیفیت ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر ایک پر طاری ہو....

اچھا! ایک بات بتاؤ.... اگر اس کی شادی ہو جائے تو تمھیں، افسوس ہوگا؟....

یہ تو شادی کی نوعیت پر منحصر ہے....

یعنی....

اگر شوہر قدر دان ہے.... اچھا ہے... اور وہ بھی خوش ہے تو مجھے کوئی رنج نہیں ہوگا.... اور اگر خدا نخواستہ....

ارے بھیا! اِن اُلٹی سیدھی باتوں کو جانے دو.... ان میں کچھ نہیں

رکھا... پورا مستقبل تمہارے سامنے ہے... اس کو کیوں دیمک لگاتے ہو... ہنسو، کھیلو اور کچھ کام کرو....

تو میں نے یہ کب کہا کہ میں زندگی کی تمام مشغولیتوں سے استعفیٰ دے چکا ہوں۔

آثار تو کچھ ایسے ہی نظر آتے ہیں....

یہ تمہارا خیال ہے....

تو پھر منھ اُٹھائے آسمان کی طرف کیا دیکھ رہے تھے....

ستاروں کو....

پھر وہی ستارے....

ہاں! انھیں ستاروں کے ساتھ میری زندگی وابستہ ہے....

اللہ رے وابستگی!....

ایک لمبی سی ہوں کے بعد اب جاوید کا منھ آسمان کی طرف اُٹھ گیا....

جاوید!!

ہوں!

اب کیا تم نے اختر شماری شروع کر دی....

ہاں.. میں بھی ستاروں کی سرگوشیاں سُن رہا ہوں،...

اچھا جی!! کیا آواز آ رہی ہے؟....

کچھ تمہارا ہی ذکر ہے....

میرا...؟ خدا خیر کرے....

ہاں.... ان ستاروں سے ایک سریلی آواز بھی آ رہی ہے،....

سریلی آواز؟

ہاں تمہاری اُن کی آواز.... وہ کہہ رہی ہے کہ عشرت پاگل ہے،

چلو، آؤ ٹہلنے چلیں.....

مجھے اپنے پاگل پن پہ ناز ہے.... تم ٹھہرو، میں تیار ہو کر ابھی آتا ہوں......

.....※.....

جواب

فائرنگ رک گئی تھی۔۔۔۔۔ دشمن پسپا ہو گیا! رام سنگھ کی انگلی ٹریگر سے ہٹی اور اس نے اطمینان کا سانس لے کر انگڑائی لی۔۔۔۔
عارضی جنگ بندی کے بعد، اپنی کھوئی ہوئی پوزیشن حاصل کرنے کی اس طرح کی ناکام کوششیں دشمن کی فوجیں مسلسل کر رہی تھیں۔۔۔
رام سنگھ بھی اپنے مورچے سے باہر نکلا۔۔۔۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح خاموش۔۔۔ کسی بھی قسم کے جذبات سے مستثنیٰ۔۔۔ آنکھیں کسی یونیورسٹی پروفیسر کی طرح ایک انجانی سوچ میں ڈوبی ہوئیں۔۔۔ ہاتھ ایک جفاکش کسان کی طرح سخت اور پیشانی پر ایک مستحکم قوتِ ارادی کی واضح لکیر۔۔۔۔

لو بھئی پھلپھی آ گیا۔۔۔۔

آؤ ساد ھوجی مہاراج۔۔۔۔

گرو جی کی جے! ....

آؤ پیارو وڈ .... کی گل اے ....

اور اسی طرح کے پیار بھرے جملے اُس کا استقبال کرتے رہے ...

وہ زیر لب مُسکرایا ..... ایک زخمی مسکراہٹ ...

اُجڑے ہوئے کھیت! شکست خوردہ ٹینک اور توپیں، آسمان پر لہراتے ہوئے گدھ .... مرے ہوئے مویشی .... اپنے بہت سے ساتھیوں کی چِتا کی گرم راکھ .... رحیم اور جاوید کی تازہ قبر ... اُس کی نظریں دور تک بربادی کے اُس مسلسل منظر کو دیکھ رہی تھیں .... اور وہ ان ویرانیوں کے ڈھیر پر بیٹھ کر سوچنے لگا ....

اور اُس نے دیکھا ...

ایک غیر مرئی ہیولا، سامنے میدان میں بکھرے ہوئے ٹینکوں بھاگتے ہوئے دشمن کی پیچھے چھوڑی ہوئی توپوں ... تباہ شدہ بکتر بند گاڑیوں کو اکٹھا کر رہا ہے .... اور وہ سب پھدک پھدک کر بچوں کے کھلونوں کی طرح ایک دوسرے کے نزدیک آ رہے ہیں .... اور پھر جیسے ایک بجلی چمکی .... روشنی کی اس تیز لہر نے ان سب کو موم کی طرح پگھلا دیا .... اور پھر اس پگھلے ہوئے موم سے ٹریکٹر بن گئے .... چھوٹے چھوٹے کھلونے .... مگر پھر جیسے ان میں ہوا بھرنی شروع ہو گئی .... پھر زمین ہموار ہونے لگی۔ ٹریکٹر چلنے لگے .... اور ان کے پیچھے پوری ایک ڈویژن فوج .... مگر انکی یونیفارم دھوتی، کرتے اور پاجامے میں بدل گئی .... ان کے ہاتھوں میں آٹومیٹک ہتھیار، درانتی ہل اور لاٹھی بن گئے .... اور انکے

پیچھے سروں پر کھانا اور ہاتھ میں لسی کے لوٹے لیے کچھ نئی دلہنیں اور کچھ کنواری البیلی نار شرماتی۔ لجاتی یا پھر گیت گنگناتی چلی جا رہی ہیں... بارش ہوئی... ہر بن مو سے ساون کا نغمہ پھوٹ نکلا... جھولے لٹکنے لگے... دھرتی کی کوکھ ہری ہو گئی... حد نظر تک ہریالی چھا گئی... کھیتی پک گئی... اور کچھ گبرو جوان بھانگڑے کی دھن پر تھرکنے لگے...

چاچا... فلاسفر... کہاں کھو گئے — کیا چاچی یاد آ رہی ہیں وہ چونکا اس نے مسکرا کر حمید کی طرف دیکھا...

نہیں تو... اس نے جھینپتے ہوئے کہا...

حمید ہمیشہ کی طرح قہقہہ لگاتے ہوئے آگے بڑھ گیا...

اور رام سنگھ کی سوچیں پھر سے جوان ہو گئیں... یہ حمید... ابھری ہوئی جوانی کا گرم خون... اگر میرا پہلا لڑکا زندہ رہتا.. تو وہ اتنا ہی ہوتا... یہ سوچ کر اسے ایکبار پھر حمید پر پیار آ گیا، اعظم گڑھ کی بستی کے دیہات کا یہ کھلتا کھیلتا.. مسکراتا بتول... دیس، دیس کے لوگ.. مختلف عمر اور مزاج کے لوگ آج کیوں اس زمین پر ایک جھنڈے تلے موت اور زندگی کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اور اس سوال کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں ٹھاکر پریم سنگھ کا چہرہ ابھرا... جو اس کے باپ بھی تھے اور گاؤں کے سرپنچ بھی...

عجیب شخصیت تھی ان کی بھی... تقریباً ۱۸ سال ہو گئے انہیں اس دنیا سے گئے ہوئے... کس قدر تیزی اور پابندی سے وقت کا پہیہ گھومتا رہتا ہے... رام سنگھ ماضی کی راکھ میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ

کر چنگاریاں نکالنے لگا ... ٹھاکر جی کی زندگی میں کبھی اس گاؤں کے لوگ عدالت نہیں گئے .... وہ اُن کو بھگوان کا اوتار سمجھتے تھے ....
ٹھاکر جی کا دھرم تھا کہ وہ کسی جیو کو دکھ نہ پہنچائیں ... اور وہ پوری زندگی عملاً اس کا پرچار کرتے رہے .... ان کی چوپال پر ہمیشہ نیائے انصاف اور اہنسا کا دیا جلتا رہا .... ان کی بظاہر پُر سکون زندگی میں دو دن رام سنگھ کے حافظے میں اب بھی محفوظ تھے ... وہ چھوٹا سا ، اسکول میں پڑھتا تھا کہ اس نے شور سنا ... ٹھاکر جی زخمی ہو گئے .... وہ روتا ہوا اسکول سے بھاگا ... اور جب وہ چوپال پر پہنچا تو ٹھاکر جی اپنے مونڈھے پر بیٹھے مسکرا رہے تھے ... ان کا ایک ہاتھ پٹیوں میں بندھا ہوا تھا . جس میں سے خون کی بوندیں ابھر رہی تھیں .... اس نے سُنا ... دو بھیڑیے ایک کھیت میں گھس آئے تھے اور ایک چماری اپنے بچّہ کو گھاس پر لٹا کر اس کھیت میں کام کر رہی تھی . ایک بھیڑیے نے اس کے بچّہ کو اٹھا لیا ... وہ چیختی چلاتی وہاں سے بھاگی .... ٹھاکر صاحب شام کو لاٹھی لیے اپنے کھیت دیکھ کر واپس آ رہے تھے .... اور انھوں نے اپنی بے پناہ جراٴت اور ہمت سے ایک بھیڑیئے کو مار گرایا اور دوسرا بھاگ گیا ... اور وہ زخمی بچے کو لے کر لوٹ آئے ....

دوسرا دن وہ اس سے بھی عجیب تھا .... دیش آزاد ہوا ... اور گھروں میں خوشیوں کے چراغ جل بھی نہ پائے تھے کہ خون کی ہولی کھیلی جانے لگی ....

ان دنوں وہ فوج سے ایک مہینہ کی چھٹی لے کر گھر آیا ہوا تھا ... اور اپنی نئی نویلی دلھن سے سرگوشیوں میں مصروف تھا کہ باہا کار کا

ایک شور اٹھا.... وہ چونک کر باہر نکلا.... ٹھاکر صاحب تیزی سے
گھر میں آئے اور بندوق اٹھا کر باہر نکل گئے..... رام سنگھ چونک گیا
... باباجی اور بندوق... وہ تو نہ جانے کب سے یہ کہنے لگے تھے کہ
بندوق بیکار چیز ہے... اس سے کہیں زیادہ کار آمد توپل کی
پھالی ہے۔ عورت کا چمٹا ہے... جن کا آخر کچھ مقصد تو ہے...
اور لوگ یہ سن سن کر ہنستے تھے... وہ ٹھاکر صاحب جن کے
نشانے کی سو سو کوس دھوم تھی... بڑے بڑے انگریز افسر جن کے
ساتھ شکار کھیلنا اپنی عزت افزائی سمجھتے تھے... وہی بندوق
کو اچانک بیکار سمجھنے لگے..... اگر کبھی کوئی شکار کی بات بھی کرتا
تو وہ مسکرا کر کہتے.... جس طرح بیوہ عورت گہنے، پاتے چھوڑ
دیتی ہے.... میں بھی بندوق کو بیچ چکا ہوں... کبھی کہتے... اب ہم
آزاد ہیں اور ہم نے آزادی کی جنگ اہنسا کے ہتھیار سے جیتی ہے۔
ہم نے دنیا کو صلح، امن اور شانتی کا سبق دیا ہے.... اور اب ہم اس
آزاد دیش میں بھی وہی چراغ جلائے رکھیں گے...

باباجی اور بندوق... رام سنگھ ایکبار پھر حیرت کے سمندر میں
غوطہ کھا گیا... اور وہ بھی ان کے پیچھے لپکا... اس نے دیکھا کہ
ایک طرف ہزاروں لوگوں کا مشتعل ہجوم ہے... جو دوسرے گاؤں
سے آئے تھے.... اور ان کے سامنے سب سے آگے کھڑے ٹھاکر صاحب
کہہ رہے تھے...

"اس گاؤں میں کوئی ہندو کوئی مسلمان نہیں ہے۔ یہاں سب انسان
بستے ہیں۔ بدبختو! تمہاری اس ذہنیت نے ملک کے دو ٹکڑے کرا دیئے۔

اور اب بھی تمھیں سکون نہیں ہوا... یہاں سے چلے جاؤ... آزاد دیش کے غلام۔ پاگل، درندو... دیکھو تمھارا ادر رحیم علا یا۔ دونوں میرے گاؤں کے وہ سندر ہیں جن تک پہنچنے کے لیے سب سے پہلے تمھیں میری اور میرے بیٹے رام سنگھ کی لاش اور پھر میرے گاؤں کے ایک ایک مرد کی ارتھی سے گزر کر پہنچو گے...

اور وہ لوگ شرمندہ ہو کر لوٹ گئے... بابا جی نے تمام لوگوں کو چوپال پر جمع کیا... اور ان سے کہا... لڑنا بری بات ہے... جنگ ہر دیش میں تباہی لاتی ہے... اس سے بچو اور نفرت کرو... مگر یاد رکھو! جب تم یہ محسوس کرو کہ اب تمہاری آن، بہن بیٹیاں تمہارے آدرشوں پر آنچ آ رہی ہے تو ہر ہاتھ کو ایک تلوار۔ ایک بندوق اور ہر سینہ کو ایک دیوار... ایک ڈھال بن جانا چاہیئے۔ ... اس وقت اگر تمہارا کوئی دھرم ہے تو دشمن کو ختم کرنا... ورنہ انسانیت میں محبت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور چیز نہیں ہے... مگر ہر گاؤں سیتا پور نہیں تھا... اور نہ ہی ہر ایک گاؤں میں کوئی ٹھاکر پریم سنگھ...

مذہب کے نام پہ لوگوں نے آگ اور خون سے ہولی کھیلی... انسانیت کی عبا تار تار کر دی گئی... ماں کو بازار میں ننگا نچایا گیا... اور ٹھاکر پریم سنگھ یہ خبریں سن سن کر بتاشے کی طرح بیٹھے جاتے تھے... وہ بیٹھے بیقراری سے ہاتھ مَلا کرتے... ہائے یہ اپنے دیش کی ہی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ اب کیا ہوگا... اور ایک دن جب نوکر حقہ لے کر چوپال پر گیا... تو بابا مونڈھے پر کچھ اس طرح سوئے تھے کہ پھر اٹھ ہی نہ سکے...

راموچاچا! چائے... رام سنگھ پھر چونک گیا۔ حمید اس کے

پاس دونوں ہاتھوں میں مگ لیے کھڑا تھا۔۔۔ اس نے مگ لیتے ہوئے پھر ایک نظر اجڑے ہوئے میدانِ جنگ پر ڈالی۔۔۔ اور بربادی کے اس مسلسل منظر سے اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔۔۔ اور اس کے دکھی دل نے ایک سوال کیا؛

کیا یہ سب بڑا نہیں ہے۔۔۔ کیا لڑائی کوئی اچھی چیز ہے۔۔۔ نہیں، لڑائی بہت بری ہے۔۔۔ یہ ایک مکمل تباہی کی ابتدا ہے۔۔۔ اور پھر اس کی نگاہوں کے سامنے ٹریکٹر، ہل، بیل اور کسان سب موم کی طرح پگھل کر بہنے لگے۔ اور اس موم کے دریا سے ایک لمبی زنجیر جھنجھناتی ہوئی نکل کر پھیلتی چلی گئی۔۔۔ لمبی اور لمبی۔۔۔ جیسے اس نے پورے دیش کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔۔۔ اور پھر ایک قافلہ۔۔۔ مسلسل قافلہ۔۔۔ مدقوق چہرے۔۔۔ بال بکھرائے، چہروں پر گرد۔۔۔ سب پا بہ زنجیر۔۔۔ اور زخمی۔۔۔ رام سنگھ۔۔۔ اس کو دور سے ایک آواز آتی سنائی دی۔ جیسے کوئی اندھیرے کنوئیں سے بول رہا ہو۔۔۔ اور آواز کی لہروں سے ایک چہرہ ابھرا۔۔۔ سفید سر۔ سفید گھنی مونچھیں۔۔۔ بارعب چہرہ، وہ ٹھاکر پریم سنگھ تھے۔۔۔ ان کی نگاہ ایک طرف اٹھی۔۔۔ اور رام سنگھ کانپ گیا۔۔۔ اس کی کملا بھی اس زنجیر میں لپٹی گرتی پڑتی چلی جا رہی ہے۔۔۔ اور اس کا سب سے چھوٹا بیٹا خون میں بھری انگلیاں چوس رہا ہے۔۔۔ وہ بیہوش ہو کر گرنے والا ہی تھا۔۔۔

رامو چاچا!! حمید نے اسے دھکا دیا اور وہ خود بھی اس کے ساتھ زمین پر آ رہا۔۔۔ دشمن کے دو جہاز گولیاں برساتے ہوئے نکل گئے۔۔۔ کیکر کے اکلوتے پیڑ کے نیچے رکھا ہوا پانی کا گھڑا ٹوٹ گیا۔۔۔

دھائیں .... دھائیں .... جمانہ مار توپیں آگ اُگل رہی تھیں ..
رام سنگھ نے پیار سے حمید کا ہاتھ دبایا .... اور مسکراتے ہوئے بولا
.... او چھوکرے ! تو نے میری چادر گرادی ....

ابھی لایا چاچا .... حمید نے لیٹے لیٹے ایڑیاں بجائیں .... اور ایک ہی جست میں تمگ اُٹھا کر کھڑا ہوا اور کیمپ کی طرف دوڑ گیا ....

اور رام سنگھ نے ایک طویل انگڑائی لی جیسے اُسے سارے سوالوں کا جواب مل گیا ہو ....

شٹل کاک

"اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں گہری اداسی ناچتی ہے۔" یہ تھا میرا
خیال جو میں نے ایڈنا کو پہلی مرتبہ دیکھ کر قائم کیا تھا... مسٹر اینڈ
مسٹر پیٹر سے میرے پرانے تعلقات ہیں... اور ایک زمانے میں میری
شامیں اکثر اُن کے یہاں گذرتی تھیں... انھیں کے یہاں ایک معمولی
سی شام کو میں ایڈنا سے متعارف ہوا...

"آپ سینٹ تھامس اسکول کی ہیڈ مسٹرس ہیں..."

"شکریہ ہے آپ نے بتا دیا... ورنہ میں تو ہائی اسکول کا طالب علم
سمجھ رہا تھا......"

چند قہقہے بکھرے مگر ایڈنا خاموش رہی... اور پھر باتیں ہوتی رہیں
موسم کے متعلق... شکار کے پروگرام... بیڈمنٹن ٹورنامنٹ
... ہندوستانی کرکٹ ٹیم کا آسٹریلیا کا دورہ ... ٹوکیو کے یونیورسٹی
گیمس... چین کے ایٹمی تجربات اور خانہ جنگی... مشرقِ وسطیٰ کا بحران

ویت نام کی جنگ .... یونین ایکشن .... مخلوط وزارتیں .... ملک کی
غذائی اور معاشی حالت .... کشمیر کے سبزہ زار .... بازار میں سبزیوں کی
کمی .... آسمان کی چھوتی ہوئی قیمتیں .... مسز پیٹر کے تلے ہوئے مزیدار مٹن چالیس
.... مسز قریشی کے نرگسی کوفتے .... تاج ہوٹل کی بریانی .... آگرہ کا تاج محل
.... بھاکرہ ڈیم .... لسانی ریاستیں .... طالب علموں کی بدنظمی .... اور
نہ جانے کیا کیا .... تان میرے تبادلہ پر آکر ٹوٹی ....

عشرت ترقی پر جا رہے ہیں، اُن سے پارٹی ....

اور اسی طرح گھنٹوں گزر گئے .... ایڈنا خاموش بیٹھی سنتی رہی ....
ایک دفعہ بھی اس کے لبوں کو جنبش نہیں ہوئی .... میں نے کئی بار اسے مخاطب
کرنے کی کوشش بھی کی .... مگر جواب میں اس کی شفاف پیشانی پر ایک
رگ میں ہلکا سا تحرک، اور نازک لبوں کے گوشوں میں ایک موہوم سی لرزش ....
میری چونکہ پہلی ملاقات تھی .... اس لیے میں نے بھی زیادہ بے تکلفی
کی کوشش نہیں کی .... مگر ایڈنا کی خاموشی .... اس کی بڑی بڑی اٹھی
ہوئی آنکھیں .... اور ایک انجانی سی شباہت، نہ جانے کیوں میرے
ذہن کے گوشوں کو کریدتی رہی .... طویل محفل برخاست ہوئی، اور
میں نے پھر کبھی آنے کا وعدہ کر کے رخصت لی ....

میں جان بوجھ کر دو روز تک مسٹر پیٹر کے یہاں نہیں گیا .... تیسرے
روز ٹہلتے ٹہلتے بیگم باغ کی طرف گیا .... صبر نہ ہو سکا اور مسٹر پیٹر کی
طرف چلا .... گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ دونوں میاں بیوی بازار گئے ہیں
.... اور دروازے میں ایڈنا اپنی بڑی بڑی اُبلی ہوئی آنکھوں میں
سرخ ڈورے لیے کھڑی تھی .... بال بکھرے ہوئے اور کپڑے تقریباً میلے ....

ہم دونوں چند لمحے خاموش رہے۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر اُس نے آہستہ سے کہا
۔ ۔ ۔ ۔ "آئیے ۔ ۔ ۔ ۔ اندر تشریف رکھیئے ۔ ۔ ۔ ۔"

"ارے ! آپ بول سکتی ہیں ۔ ۔ ۔ !" میں نے اُسے سنبھالنے کی کوشش کی۔
اس کے چہرہ پہ موہوم سا تغیر بھی نہیں ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ایک تھکے تھکے سے انداز میں اُس نے راستہ چھوڑ دیا ۔ ۔ ۔ اور چند لمحوں بعد ہم خاموش ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے ۔ ۔ ۔ ۔

سامنے دیوار پر حضرت عیسیٰ کی تصویر لگی تھی ۔ ۔ ۔ ان کا سینہ چاک، اور دل ان کے ہاتھ میں تھا ۔ ۔ ۔ اُن کے چہرے پر پُر اسرار معصومیت اور تقدس سے ایک روحانی کیف مجھے اپنی رگوں میں حلول ہوتا ہوا محسوس ہوا ۔ ۔ ۔ دوسری طرف دیوار پر ایک بڑا گھنٹہ لگا تھا ۔ ۔ ۔ جس کی ٹِک ٹِک اور پنڈولم کا تحرک اس کے جاگنے کی خبر دیتا تھا ۔ ۔ ۔ مگر کلاک کی بڑی بڑی سوئیاں ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی تھیں ۔ ۔ ۔ ہم تین منٹ خاموش بیٹھے رہے ۔ ۔ ۔ اور تین منٹ کی خاموشی مجھے اس طرح لگی جیسے تین صدیاں بیت گئی ہوں ۔ ۔ ۔ میں پاگلوں کی طرح وقت کا دامن پکڑنے کو بھاگ رہا ہوں ۔ ۔ ۔ اور وہ اپنی دو چھوٹی بڑی سوئیوں پر اس قدر تیزی سے بھاگا جا رہا ہے کہ میں اُسے چھو نہیں پاتا ۔ ۔ ۔ ۔

میں نہ جانے کیا کہنا چاہتا تھا مگر الفاظ بھی میرا ساتھ چھوڑتے نظر آتے تھے ۔ ۔ ۔ میں نے ایک بار پھر ایڈنا کی طرف دیکھا ۔ ۔ ۔ وہ اپنی پتلی اور نازک انگلیوں کے ناخنوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی ۔ ۔ ۔

"اچھا ! اب میں چلونگا ۔"
اس نے رسمی طور پر بھی مجھ سے رکنے کے لیے نہیں کہا اور میرے ساتھ ہی کھڑی

ہوگئی.... مجھے سخت ذہنی کوفت ہوئی.... اور ابھی میں نے بمشکل دروازے
سے باہر قدم نکالا تھا.... کہ پیچھے سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی....
میری زبان پہ نہ جانے کیوں چند گالیاں اُبھریں.... مگر میں نے اُبلتے
ہوئے غصّہ کو پیتے ہوئے طے کیا کہ اب یہاں کبھی نہیں آؤں گا.... میں
نے بزعم خود آخری بار مڑ کر گھر کی طرف دیکھا....

وہ اُسی طرح پُرسکون اور خاموش کھڑا تھا.... زندگی کے تھکے تھکے
قدم یونہی رواں دواں تھے اور کسی قسم کے طوفان کا کہیں دور دور تک
پتہ نہ تھا......

میرا غصّہ بابی کڑھائی کے اُبال کی طرح چڑھتا اور اُترتا رہتا ہے...
اور یوں بھی میں نے سوچا.... مجھے ایڈنا سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟
کیا میں اس سے شادی کرنے والا ہوں؟.... شادی! مجھے اس خیال
سے ہی ہنسی آگئی.... ایڈنا جیسی خاموش اور ڈھیلی ڈھالی لڑکی کو
شریکِ حیات بنانے کا تصور ہی مضحکہ خیز تھا.... پھر وہ خاموش رہے
یا دن رات چیخے.... مجھے اس سے کیا.... مگر یہ سوچ کر بھی میرا دل
مطمئن نہ ہو سکا......

اور اچانک مجھے بیملا یاد آگئی.... اُس کی دوستی کے لیے کتنے پاپڑ بیلے
سائیکل سے ٹکرانے تک نوبت آگئی.... اور جب وہ بھی دیوانہ وار چلنے
لگی تو پھر نہ جانے کیوں مجھے اُس سے اُلجھن ہونے لگی.... مگر وہ جتنی
خوبصورت تھی.... اتنی ہی جہاں دیدہ بھی.... مجھے اچانک اس کی
شادی میں شرکت کا دعوت نامہ ملا.... میں نے بیملا سے شکایت کی....
اُس نے مسکراتے ہوئے کہا....

Befair Ishrat ..... تم ایک اچھے کھلاڑی ہو..... یہ میں بھی مانتی ہوں ... مگر بدقسمتی سے تم زندگی کو بھی بیڈمنٹن کا ایک گیم سمجھتے ہو، ہر شٹل کاک تمہارے نزدیک ایک لڑکی ہے ... جس تک پہنچنے کے لیے تم جی جان سے کوشش کرتے ہو ..... اور جب اس کے پاس پہنچ جاتے ہو تو پھر اُسے واپس اُسی کوٹ میں پھینکنا چاہتے ہو۔ جہاں سے وہ آئی تھی .....

مجھے کوئی مناسب جواب نہ سوجھ سکا ... اور اس سے پہلے میں کچھ کہتا ..... اُس نے کہا

شکایت تو مجھے ہونی چاہیئے ..... تم میری شادی میں شریک نہ ہوئے ... خیر شام تک ٹھہرو ... میں تمھیں جوزف سے ملاؤنگی ..

میں نے مسکراتے ہوئے مبارکباد دی اور اس نے خوش دلی سے شکریہ ادا کیا ..... اور بات ختم ہوگئی ... بیتے لمحات کی یاد ایک کسک آمیز مسکراہٹ لے آئی

ہلو پرنس چارمنگ ! کہاں غائب رہتے ہو ...

ہلو مسٹر پیٹر۔ میں نے اُٹھتے ہوئے انھیں خوش آمدید کہا، میری مسلسل غیر حاضری کا شکوہ ..... اور میرا فرض مشغولیت کا بہانہ اور چند منٹ بعد میں مسٹر پیٹر کے ساتھ پھر ان کے گھر جارہا تھا

وہاں دن بھر لطیفے رہے ... اور بھی چند مہمان تھے ... ایڈنا نیلی ساری میں بہت پیاری لگ رہی تھی ... پھر ایک انجانی شباہت - وہی خاموش ، خاموش پُرسکون چہرہ .....

مس ایڈنا ... میں آپ کے اسکول آنے والا تھا !

کیوں؟ کیا کوئی تقریب تھی وہاں؟ کسی مہمان نے مجھ سے وضاحت چاہی۔

"نہیں! میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ کوئی گونگوں کا اسکول تو نہیں ہے....."

سب حاضرین نے ایک دھواں دھار قہقہہ بلند کیا اور پہلی مرتبہ ایڈنا مسکراہٹ ضبط نہ کر سکی.....

شام کے وقت بیڈمنٹن کھیلنے کا پروگرام بنا... میں تو خدا سے چاہتا تھا... کالج کے دنوں میں اپنی یونیورسٹی کا چیمپین رہ چکا تھا... اور وہی ہوا کوئی میرے مقابلہ پر نہ ٹھہر سکا... حاضرین اور خاص طور سے خواتین کو متاثر کرنے کے لیے Fore hand کی شٹل کو Back hand پر لے کر بازی گری کرتا رہا... تقریباً سب ہی کھیلے اور بُری طرح ہارے.....

مسز پیٹر اور دیگر حضرات کے بے پناہ اصرار پر ایڈنا بھی کورٹ میں آئی... خاصا اچھا کھیلتی تھی..... میں نے اُسے کورٹ میں کافی نچایا۔ اور جب میں یہ محسوس کرتا کہ ایڈنا تھکنے لگی ہے تو میں شٹل کبھی سائڈ گیلری کبھی آؤٹ اور کبھی نیٹ میں مار کر پوائنٹ ہار جاتا تھا.....

12 Love Edna Serving..... مسز پیٹر میرے جان بوجھ کر ہارنے پر خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں.....

(Here Comes "Fairy Queen" to Conquer Prince Charming.) پریوں کی رانی خوبصورت شہزادہ کا دل جیتنے آ گئی.....

بوڑھے البرٹ نے جملہ کسا اور ایڈنا گیم ادھورا چھوڑ کر اندر چلی گئی...

تھکا ہوا سورج شفق کی آغوش میں گر پڑا.....

میرا ٹرانسفر ہو ہی چکا تھا..... نئی جگہ..... نئے لوگ..... اور نئی مشغولیت..... زندگی نے پھر رُخ بدلا..... عہدِ ماضی جیسے ایک بھولا ہوا خواب تھا۔

اچانک امّی نے میری شادی کہیں طے کر دی..... اور جب دوستوں کو دعوت نامے بھیجنے کا سوال آیا تو مجھے مسٹر اینڈ مسز پیٹر اور ان سب کے ساتھ ایڈنا بھی یاد آئی..... میں نے دعوت نامہ بھیج دیا.....

شادی ہو گئی..... مجھے مسٹر اینڈ مسز پیٹر کی عدم شرکت پر تعجب ہوا..... اور مزید تعجب اس پر کہ انھوں نے مبارکباد کا خط تک بھی نہیں لکھا..... چونکہ شکایتوں سے زندگی کے قدم نہیں رُکتے اس لیے میری زندگی بھی اپنے میکانکی انداز میں صبح و شام کے سانچوں میں ڈھل رہی تھی کہ اچانک مجھے ایک سرکاری کام سے میرٹھ جانا پڑا.....

بل بیگم پر نوویلٹی اسٹورس سے مسز پیٹر نکل رہی تھیں..... اور ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئے..... انھوں نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ تھاما..... اُن کی آنکھیں نم تھیں..... میں نے فوراً شکایت مناسب نہ سمجھی، اور ہم دونوں ساتھ ساتھ گھر آ گئے.....

وہی گھر، وہی ماحول..... سامنے دیوار پر حضرت عیسیٰ کی تصویر..... اور دوسری طرف وہی گھنٹہ..... اور میں نے چاہا کہ پوچھوں ایڈنا کہاں گئی کہ اچانک مسٹر پیٹر آ گئے..... انھوں نے گلے لگایا..... مبارکباد دی..... اور ساتھ ہی ساتھ معذرت.....

بھئی عشرت! تم تو ہلس کشمیر جا کر بالکل بھول گئے..... تمہاری شادی کا دعوت نامہ ملا تھا..... مگر اچانک وہ لفافہ غائب ہو گیا.....

پتہ ہمیں معلوم نہیں تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اُدھر ایڈنا کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ۔ ۔ ۔ ہم لوگ اسی پریشانی میں لگ گئے ۔ ۔ ۔ ۔

"ایڈنا ٹھیک تو ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ " میں نے گھبرا کر پوچھا ۔ ۔ ۔

نہیں ۔ ۔ ۔ وہ تو دوسرے روز ہی خدا کو پیاری ہو گئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔

مسز پیٹر رومال آنکھوں پر رکھ کر سسکیاں لینے لگیں ۔ ۔ ۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا ۔ ۔ ۔ مسٹر پیٹر نے شفقت سے میرے شانہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ خود ایڈنا کی بہن پمیلا بھی وقت پر نہیں پہنچ سکی ۔ ۔ ۔

آپ کا مطلب ہے پمیلا جوزف ۔ ۔ ۔ !

ہاں ! وہ آج کل مسوری میں ہے ۔ ۔ ۔

اور اس کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو مسز پیٹر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دے رہی تھیں ۔ ۔ ۔ اور مسٹر پیٹر تولیہ بھگو بھگو کر میرے سر پر رکھ رہے تھے ۔ ۔ ۔

چند لمحے بعد میری طبیعت ٹھیک ہو گئی ۔ ۔ ۔ اور میں معذرت کر کے چلنے لگا ۔ ۔ ۔

چلتے وقت مسز پیٹر نے ایک چھوٹا سا پرچہ دیا ۔ ۔ ۔

"یہ مرتے وقت ایڈنا کی مٹھی میں تھا ۔ ۔ ۔ مگر عشرت یہ خیال رہے ۔ ۔ ۔ یہ اس کا راز تھا جسے میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا ۔ ۔ ۔

میں نے خاموشی سے پرچہ کھولا ۔ ۔ ۔ لکھا تھا ۔ ۔

مسوری !

۲ جون ۱۹۶۵ء

پیاری ایڈنا!

امید ہے تم خیریت سے ہوگی.... آج میں اپنا البم دیکھ رہی تھی تو میں نے دیکھا، میرے ایک دوست عشرت کی تصویر اس میں سے غائب ہے... مجھے تصویر کے غائب ہو جانے کا تو افسوس نہیں... بس صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر وہ تصویر تم ہی نے لی ہے تو خدارا اس کے بارے میں سنجیدہ نہ ہو جانا.... وہ گو دل کا اچھا مگر ایک لاپرواہ آدمی ہے.... اور اس کے نزدیک کسی بھی لڑکی کی حیثیت شٹل کاک سے زیادہ نہیں.... شاید پیٹرس کے یہاں اس سے ملاقات ہو.... اپنی صحت کا خیال رکھنا.... باقی تم خود سمجھدار ہو.....

تمہاری چاہنے والی بہن

پملا جوزف

"تمھیں اپنی تصویر واپس چاہیئے...." مسز پیٹر نے دریافت کیا

"نہیں" میں نے آہستہ سے کہا اور تھکے تھکے قدموں سے ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح باہر نکل آیا۔

—(:)—

ہاہا، اب تماشا ہوگا.... بچے خوشی سے چلانے لگے.... وہ دیکھو کٹھ پتلی والا آگیا....

میں برآمدہ میں خاموش کھڑا تھا....

"کیسے بانکے نواب آئے...." ڈھولک پر تھاپ پڑی.... بوڑھے استاد کی انگلیوں کو حرکت ہوئی اور بڑھیا نے اپنی بے سُری آواز میں الاپ شروع کیا....

سر پر صافہ.... اس پر جھالر.... لمبی اچکن.... چمکیلے بٹن.... چوڑی دار پاجامہ.... سلیم شاہی جوتا.... پوری نوابی آن بان سے ایک پتلا آیا... اور بازی گر کی مشاق انگلیوں کی مدد سے تھرکتا چلا گیا....

نواب صاحب، راجہ، مہاراجہ، بادشاہ، شہنشاہ، وقت کے بیرحم ہاتھوں نے کیسے کیسے صنم توڑ دیے.... ان کی

ابرو کی ایک ہلکی سی جنبش، ایک شانِ بے نیازی سے خزانوں کے منھ کھول دیا کرتی تھی.... اور آج وہ اپنے پروی پرسیز Privy Purses بچانے کے لیے ایجی ٹیشن کی تیاریوں میں مصروف ہیں..

مگر ہمارا رامو نہیں مانتا... وہ آج بھی کسی ہاتھی کو دیکھ کر پرنام کرتا ہے چونکہ یہ مہاراجہ کی سواری ہے.... رامو گھر کا پرانا نوکر ہے سب کا منھ چڑھا....

ایک دن نسیم نے کہا.... رامو دادا بھگوان سے پرارتھنا کیجیے۔ آپ کے مہاراجاؤں پر بڑا سنکٹ کا سمے ہے...

بٹیا! کیا ہوا.... رامو دادا نے چلم رکھ کر گھبرا کر پوچھا...

حکومت ان کے پروی پرسیز ایک قسم کا وظیفہ سمجھ تو وہ بند کرنے کی سوچ رہی ہے...

رامو دادا خفا ہو گئے...

"بٹیا! ہم سے مجاک نہ کرو....!

اس کے سفید بال، بوڑھی جہاندیدہ آنکھیں آخر تو دنیا دیکھے ہوئے تھیں.... وہ بھلا کیسے مان لیتا اور اس نے پورے یقین سے کہا..

کل کے راجہ آج کیس بھکاری ہوئے سکت ہیں.... ان کے سر پر تو لچھمی کی چھایا ہے.... ان کو تو چلتے دریا اور بہتے سمندر بھی لگان دیت ہیں....

مگر رامو دادا! لگان تو....

"چپ رہو بٹیا! ہم تمہار پتاجی کو گود کھلائے ہیں.... انگریجن کا جمانہ دیکھے ہیں... تم کا جانو... سنسار میں یہ گھور انرتھ، یہ

بھوک اور بیکاری اسی کارن تو ہے کہ انگریز مہاراجہ جفر سے دگا کیے ہیں۔۔۔۔۔ ،،

بیچارا رامو۔۔۔!

چھوا چھو!! چھوا چھو!! تیجا دھوبی کپڑے دھو رہا تھا۔۔۔ چھوا چھو!!۔۔۔ ایک محنت کش انسانی زندگی کے گریبان میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھا۔۔۔ ایک مگرمچھ آہستہ آہستہ۔۔۔ اپنے شکار کی بو سونگھتا آیا اور تیجا کو کھا گیا۔۔۔۔

او تیجا! او تیجا!! لے روٹی!! روٹی لے لے۔۔۔ دور سے ایک نغمہ بار آواز آئی۔۔۔۔

کپڑے بکھرے پڑے تھے۔۔۔۔ اور تیجا۔۔۔ تیجا کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔۔۔ دھوبن سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔۔۔ بیچاری۔۔۔

"لاگو مرتیو کا تیر"۔۔۔ بڑھیا گاتی رہی۔۔۔

واقعی موت کے سرد ہاتھ کسی پر رحم نہیں کھاتے۔۔۔ دین دیال کی بیوہ۔۔۔ بیچاری ۳ مہینے کی بیاہی تھی کہ دین دیال شریر شد ھار ے۔۔۔ اور جب میں نے اُسے اوپر کے کمرے سے اپنے سہاگ کی رنگین چوڑیاں توڑتے۔۔۔ ماتھے کی بندیا نوچتے دیکھا تو میرا دل بیٹھ گیا۔ اس کا سوگوار حسن، اس کی جوانی اور اس کا غم۔۔۔۔

"اری تیجا کو تو مگرمچھ لے گیا۔۔۔"

کوئی آواز آئی۔۔۔

ہائے میرا تیجا! ہائے میرا تیجا۔۔۔! دھوبن سر پیٹنے لگی۔۔۔

اری! تیجا مر گیا۔۔ تو اور کر لے۔۔۔۔

کسی نے مشورہ دیا....

اور وہ ایک دم کھڑی ہو گئی... گیت پھر سے جوان ہو گئے اور وہ تھرکنے لگی....

"تیجا مر گیا اور کرونگی... تیجا مر گیا اور کرونگی"

بچے قہقہے لگانے لگے....

رگھبیر نے ماں سے کہا... بھیا دین دیال تو چل بسے... تیرے طعنے اور بھیا کا دکھ... دونوں مل کر سوشیلا بھابی کی جان لے لینگے.. مرنے دے... دھرتی کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا... ودھوا ہونا پچھلے جنم کے کرموں کا پھل ہے....

مگر ماں... میں بھابی کو مرنے نہیں دونگا... میں...

چپ رہ پاپی! میں اس ڈائن کا منھ نوچ لوں گی... ماں اپنے ادھرمی بیٹے کی بات کیسے مان لیتی....

رگھبیر گھر چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہو گیا... اور سوشیلا ایک دن غائب ہو گئی....

"گوری چلی پیا کے دیس"..... بڑھیا نے سُر بدلا... اور دھوبن دلہن بن کر دوسرے دھوبی کے گھر جا رہی تھی....

بچے پھر کھل کھلا اٹھے.... کچھ بوڑھی آنکھوں میں نمی سی تھرائی... اور گلابی آنچلوں میں کچھ سرگوشیاں ابھر کر ڈوب گئیں..

صحرائے بے کنار.... ہو کا عالم.... جھکڑے لگائے پھر ہاتھ میں ایک ٹوٹا ہوا پیالہ لیے.... لیلیٰ لیلیٰ پکارتا مجنوں..

"اے شمع حسن میں ترا پروانہ ہوں"

"اے مری لیلیٰ! تو سُن لے میں ترا دیوانہ ہوں"
وجے بھی نلنی کا دیوانہ تھا.... انھوں نے بھی ساتھ ساتھ جینے اور مرنے کا فیصلہ کیا تھا.... مگر ہائے افسوس... اس ظالم دنیا کو ان دو دلوں کا ملن ایک آنکھ نہ بھایا... نلنی کی شادی نقلی گھی بیچنے والے بڑے سیٹھ سے کر دی گئی... اور وجے دل تھام کر رہ گیا... اُس کے ارمان دل میں گھُٹ کر رہ گئے.... اور ایک دن نلنی اپنے میکہ آئی... وجے موقع پاکر اُس سے ملا... وہ دیسی گھی کھا کر کافی موٹی ہو رہی تھی....
وجے نے اپنی آنکھوں سے شعلے برساتے ہوئے کہا....
نلنی... تم نے مجھے دھوکا دیا ہے...
مجھے معاف کر دو وجے...! میں مجبور تھی....
مجھے معاف کر دو وجے!... میں مجبور تھی...
میں بھی مجبور ہوں! میں کچھ نہ کچھ کر بیٹھوں گا ورنہ....
ورنہ!.... نلنی نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔
تم مجھے سیٹھ سے کہہ کر کہیں کلرک لگوا دو....
لیلےٰ کی شادی ہو گئی.... اور مجنوں مرنے چلا۔ بڑھیا گاتی رہی۔
عشق میں جان گنوائی رے....
جان بھی سچا عشق کرتا تھا.... اور جب اُس نے دیکھا کہ ریٹا کی موٹی ممی اُسکی شادی ریٹا سے نہیں ہونے دیگی... تو اُس نے عشق کو امر بنانے کا فیصلہ کیا اور ایک دن پولیس کو ریٹا کی نعش کے پاس ایک پرچہ ملا.... ہم دونوں نے اس ظالم دنیا کے بندھنوں سے تنگ آکر اپنی

زندگیاں ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے .... ریٹا زہر کھا چکی ہے .... اور میں سمندر میں ڈوبنے جا رہا ہوں ....

تین دن کی ان تھک کوششوں کے باوجود بھی پولیس کو جان کی نعش نہیں ملی .... مگر ایک ستم ظریف پولیس افسر نے اس کو داڑھی بڑھائے ہوئے بمبئی کے ایک قمار خانہ سے برآمد کر لیا ......

ریٹا کے سونے کی ایک جوڑی ... گھڑی .... نیکلس اب بھی اس کے پاس تھے جو اس نے اپنی محبوبہ کی نشانی سمجھ کر رکھ چھوڑے تھے ...

عشق کے سلسلہ میں تازہ ترین موت ابھی اقبال صاحب کی ہوئی .... وہ رضیہ سے بے پناہ محبت کرتے تھے ... انھوں نے رضیہ سے کہا تھا۔

محبت ۔ ذات ۔ برادری ۔ غربت اور دولت کچھ نہیں دیکھتی۔ میری غربت کو تمہاری امارت سے پیار ہو گیا ہے ... اور اگر تم ہندوستانی فلمیں دیکھتی ہو تو تمھیں بھی مجھ سے محبت ہوگی .... اور تم ہر ممکن قربانی کر کے صرف مجھ سے شادی کرو گی ....

(By the way) بائی دی وے میں انگریزی فلمیں دیکھتی ہوں ... تو تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی ....

نہیں !

تو میں اپنی جان دیدوں گا ...

تو پھر جلدی کیجئے .... میری شادی سیٹھ باٹلی والا سے ہو رہی ہے ...

اور اقبال صاحب نے پچھلے اتوار کو ٹھیک تیس سال بعد اپنی جان دیدی۔

بوڑھا بازیگر تمام کٹھ پتلیوں کو اسٹیج پہ لے آیا تھا.....

اور وہ سب ہاتھ جوڑے سر جھکائے کھڑی تھیں ....

بھگوان کے نام پر ایک پیسہ! مائی بچوں کی خیر... سہاگ بنا رہے بالبچوں کا بھلا... مسلمین سے اللہ کے نام پر ایک پیسہ..... اپنے پیاروں کی خیرات....

کٹھ پتلی والے کی لڑکی ہاتھ میں پیتل کی تھالی لیے مانگ رہی تھی... تھالی میں گاہے گاہے گرتے ہوئے سکوں سے پیدا ہونے والی جھنکار سے ہم آہنگ ہو کر بڑھیا کی آواز کبھی مدھم اور کبھی پنچم سروں میں ڈھل رہی تھی.....

"دنیا ایک کہانی رے بھیا... دنیا ایک کہانی...."

اور میں برآمدہ میں خاموش کھڑا بازی گر کی لڑکی کا انتظار کر رہا تھا کہ کب وہ تھالی لیے ہوئے میرے قریب آئے اور میں اُسے قریب سے دیکھ کر فیصلہ کر سکوں کہ اُس کی دعاؤں کے لیے پانچ پیسے ہی کافی ہیں یا چار آنے...

....

ختم شد